چاند میں چڑیلیں

(طنز و مزاح)

رضیہ اسماعیل

چاند میں چڑیلیں

(طنز و مزاح)

رضیہ اسماعیل

علی پلازہ - 3 مزنگ روڈ لاہور، فون : 7238014

ناشر ...... تخلیقات

اہتمام ...... لیاقت علی

نام کتاب ...... چاند میں چڑیلیں

مصنفہ ...... رضیہ اسماعیل

اشاعت ...... مئی ۲۰۰۰ء

کمپوزنگ ...... المدد کمپوزنگ سینٹر ... فون : 7114647

قیمت ...... 80 روپے

ٹائٹل ...... خواجہ افضل

پرنٹر ...... اجالا پرنٹرز' لاہور

فہرست

انتساب

اسماعیل اعظم کے نام

جو شگفتہ تحریروں کے

مداح ہیں
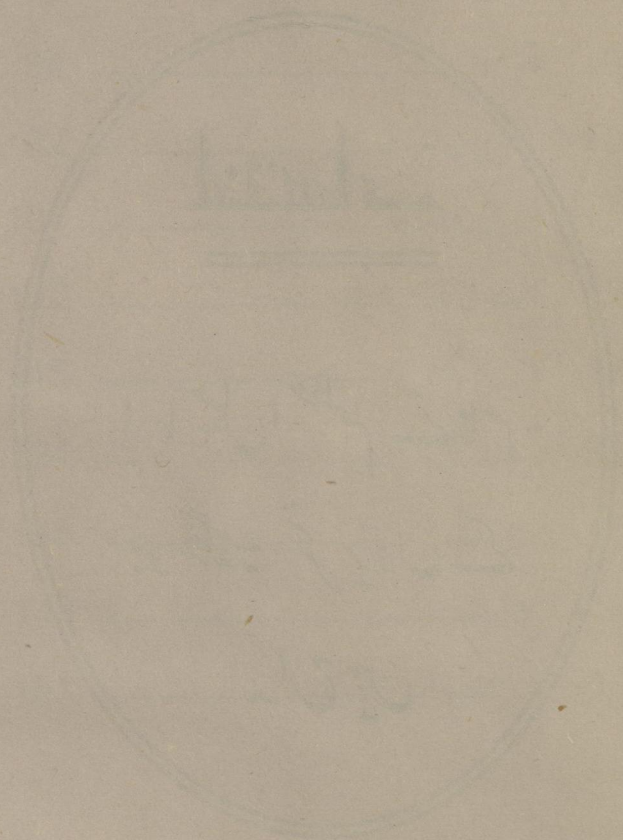
تعارف مصنفہ

رضیہ اسماعیل کا تعلق پاکستان سے ہے لیکن گزشتہ پچیس برسوں سے برطانیہ میں مقیم ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجوایشن کرنے کے بعد سلسلہ تعلیم برطانیہ میں بھی جاری رکھا۔ لندن مانٹی سوری کالج سے ٹیچر ٹریننگ کرنے کے بعد یونیورسٹی آف سینٹرل انگلینڈ سے سوشل ورک میں ڈپلومہ اور وارِوک یونیورسٹی سے سوشل ورک میں ایم۔ اے کیا۔ اس وقت برطانیہ میں محکمہ تعلیم میں ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ ایک فعال کمیونٹی ورکر ہونے کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں کئی ادبی اور سماجی تنظیموں کی رکن ہیں۔ برمنگھم میں پاکستانی خواتین کی ادبی اور ثقافتی تنظیم "آگہی" کی بانی اور صدر ہیں۔ براڈ کاسٹنگ سے وابستہ رہ چکی ہیں۔ نثر کے علاوہ شاعری بھی کرتی ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو" حال ہی میں شائع ہو کر قبولیت کی سند حاصل کر چکا ہے۔

پیش لفظ

مزاح نگاری کا مجھے دعویٰ نہیں اور طنز میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔ سچ پوچھیے تو عام زندگی میں ایک طنزیہ جملہ بھی منہ سے نکالتے ہوئے زبان پتھر کی ہو جاتی ہے۔ مبادا کسی کی دل آزاری ہو جائے۔ ان تحریروں سے بھی کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات میرے ماحول کا حصہ ہیں اور میں خود ان کا ایک کردار ہوں۔ دوسروں کی کمزوریوں پر ہنسنے کے ساتھ ساتھ اپنی بدحواسیوں پر ہنسنا بھی اچھا لگتا ہے۔ کہیں کہیں کچھ رنگ آمیزی بھی ہے۔ لیکن کسی واقعہ کو ادب بنانے کے لیے کچھ کمی بیشی تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ کیونکہ لکڑی کی صحیح تراش خراش کے بغیر فرنیچر نہیں بنتا۔

دراصل حقیقی زندگی میں مسائل، تکالیف، رنج و غم، شکر رنجیاں اور آہ و بکا اس قدر ہے کہ وہی حزن و ملال تحریر میں لانے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ نسبت مجھے شاعری سے بھی ہے لیکن شاعری ایسی چیز ہے جس پر آپ کا اختیار نہیں ہوتا۔ آپ سو فیصد پلان بنا کر شاعری نہیں کرتے۔ پتہ نہیں کس لمحے میں کیا منکشف ہو جائے۔ مگر نثر کا معاملہ اس

کے برعکس ہے۔ اسی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں آپ سے بات کرنے کو جی چاہا۔ عام زندگی میں میری شخصیت کے اس رخ سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جن کے ساتھ بات کرتے ہوئے میں "ایٹ ہوم" محسوس کرتی ہوں۔ ایسے ماحول میں ذات کے پرت خود بخود اترتے چلے جاتے ہیں اور یہی لوگ صحیح معنوں میں آپ کی شخصیت سے واقف ہوتے ہیں۔ وگرنہ تو تکلف اور تصنع کے گھٹے گھٹے ماحول میں اچھی سے اچھی شخصیت بھی سات پردوں میں جا چھپتی ہے اور بات چیت رسمی گفتگو سے آگے نہیں بڑھتی۔ ایسے لوگوں کے حصے میں صرف میری سنجیدہ طبیعت کا پرتو ہی آتا ہے۔ کہ بقول شاعر:

کیا جانئے سودا اسے کس حال میں دیکھا

لیکن ایک لکھاری اور قاری کے درمیان ایک ان دیکھی اپنائیت کا رشتہ ہوتا ہے۔ ایک پہچان سی ہوتی ہے۔ ایک الگ ہی ویولینتھ ہوتی ہے۔ بہت سی باتیں جو آپ حقیقی زندگی میں زبان سے نہیں کہہ سکتے' وہی کاغذ اور قلم کو ساتھی بنا کر بہت آسانی سے کہہ جاتے ہیں۔

میری تحریر سے اگر آپ کے چہرے پر مسکراہٹ نہ بھی آئے (کیونکہ قہقہہ لگوانا تو ہرگز مقصود نہیں ہے) تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دوبارہ پڑھئے۔ شاید آپ کی سوچ کے دروازے یا کسی کھڑکی پہ ہلکی سی دستک کی آواز سنائی دے جائے۔ اگر ایسا ہو تو آپ اپنے آپ کو اور ساتھ ہی مجھے بھی شاباش دے دیجئے۔

رضیہ اسماعیل

برمنگھم' برطانیہ

بڑی سی عمر ہوئی دودھیا سے بال ہوئے

وہ اتنا پیارا ہوا جتنے ماہ و سال ہوئے

(عدیم ہاشمی)

گرینڈمدر

انسانوں کی تو کئی قسمیں ہو سکتی ہیں مگر ہمارے خیال میں بزرگوں کی صرف دو ہی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ بزرگ جو اپنی بزرگی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسرے وہ جو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں۔

ہماری نانی اماں یعنی گرینڈمدر کا تعلق بزرگوں کے اول الذکر قبیلے سے تھا۔ نانی اماں کو اگر بزرگوں کے اس قبیلے کی چیف کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہو گا۔ نانی اماں نے مدرسہ تو دور کی بات ہے' زندگی میں کبھی کتاب بھی نہیں پڑھی تھی مگر وہ زندگی کے فلسفے کو کتابیں چاٹنے والوں سے بہت بہتر طور پر سمجھتی تھیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ وہ زبردستی دوسروں کو اپنا فلسفہ حیات سمجھانے کے لیے مثبت اور منفی دونوں طریقے استعمال کرنے سے گریز نہ کرتیں۔

ہم نانی کی اس ہٹلر جیسی عادت سے تنگ آ کر نانی کی بجائے انہیں گرینڈمدر بلکہ گرانڈیل مدر کہا کرتے تھے۔ نانی کو اس لفظ سے بہت چڑ تھی۔ ان کے خیال

میں اس انگریزی نام سے ان کا اسلامی تشخص خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ نانی خود ہمارے لیے زندگی بھر خطرے کی گھنٹی بنی رہیں۔

نانی کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا قدرے مشکل ہے۔ مگر جب ہمیں نانی سے اور نانی کو ہم سے آشنائی ہوئی تو وہ یقیناً زندگی کے گلشن سے اسی پھول نوچ چکی تھیں۔ تمام گلشن کا قریب قریب صفایا کرنے کے باوجود نانی بہت تازہ دم تھیں۔ نانی کے رعب، دبدبہ اور گرجدار آواز سے اچھوں اچھوں کا پتہ پانی ہو جاتا۔ ایسے میں اگر ہماری نحیف و نزار ٹانگیں صرف کانپنے کا فریضہ سرانجام دیتی تھیں تو اس پر نہ ہمیں اس وقت حیرت تھی اور نہ ہی اب۔

اپنی اس قدر صحت مند نانی کو دیکھ کر ہمیں دوسروں کی مریل قسم کی نانیاں بہت اچھی لگتیں۔ بچپن کی بہت سی خواہشات میں سے ہماری ایک خواہش یہ بھی رہی کہ کاش اللہ میاں ہمیں بھی ایک لرزتی کانپتی ہوئی نانی عطا کرتے۔ جس کی موتیا بھری آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک ہوتی۔ ہزار کوشش کے باوجود نانی اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکتیں۔ مصنوعی دانت ہوتے جو نانی نہ تو ہمیں دکھا سکتیں اور نہ ہی ان سے کھا سکتیں۔ کانوں میں آلہ سماعت ہوتا جسے ہم جب جی چاہتا غائب کر دیتے۔ ہماری بچپن کی ان بے تکی خواہشات کے باوجود نانی کی تمام سمعی اور بصری قوتیں پوری طرح بیدار تھیں جس کی وجہ سے ہم بچپن میں کبھی بھی ٹھیک سے خواب خرگوش کے مزے نہ لے سکے۔

اپنی اکلوتی نانی کے اس قدر صحت مند ہونے کا شکوہ ہم اکثر اللہ میاں اور کبھی کبھی اپنی والدہ سے بھی کیا کرتے۔ جو صرف مسکرا کر رہ جاتیں۔ نانی کی قابل

رشک صحت کی بدولت ہم بچپن میں کبھی صحت مند نہ ہو سکے۔ جس کی وجہ سے نانی ہم سے اور بھی نالاں رہتیں۔ نانی شاید یہ نہیں جانتی تھیں کہ برگد کے اس تنومند درخت کی شاخوں میں سے روشنی کی کوئی کرن اس کے سائے میں اگنے والے نرم و نازک پودوں تک اگر پہنچ سکتی تو تب کوئی بات بنتی۔

ویسے اس عمر میں نانی کی قابل رشک صحت ان کے لیے تو عطیہ خداوندی تھی مگر نانی پر اللہ کے انعام و اکرام کی یہ برکھا ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ نانی کے بیمار پڑنے کی خواہش حسرت میں بدل جاتی اور اس اٹکل پچو سی خواہش کی پاداش میں الٹا ہم بستر پکڑ لیتے۔

ہمارے خیال میں نانی اور اللہ میاں کے درمیان مواصلاتی رابطہ بہت زبردست تھا۔ یہ سیٹلائٹ کبھی بھی خراب نہ ہوتی۔ اسی لیے تو نانی کی دعائیں تھوک کے حساب سے شرف قبولیت پاتیں جبکہ ہماری کوئی دعا ہی قبول نہ ہوتی۔

نانی نے اپنی صحت کی مکمل ذمہ داری تو اللہ میاں پہ چھوڑ رکھی تھی مگر ہماری ننھی منی سی صحت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لادے پھرتیں۔ محلے میں سو طرح کی کھٹی میٹھی چیزیں بیچنے والے وارد ہوتے مگر کیا مجال کہ نانی انہیں کبھی گھر کی دہلیز پر رکنے دیں۔ نانی کے خیال میں یہ تھرڈ ریٹ قسم کی چیزیں کھا کر ہم بچپن میں ہی انہیں داغ مفارقت دے سکتے تھے۔

نانی کی چیرہ دستیاں اگر یہیں تک رہتیں تو خیریت تھی مگر وہ تو ہماری پرائیویٹ لائف میں بھی دندناتی ہوئی آتیں اور ہر چیز تہس نہس کر کے رکھ دیتیں۔ کتنی بھی آہستگی سے باتیں کرتے' وہ ضرور سن لیتیں۔ ہمیں پورا یقین تھا

کہ یا تو نانی کے پاس جن تھے یا پھر وہ لپ ریڈنگ کی ماہر تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ چہرے کے مختلف زاویوں سے ہی اندازہ لگا لیتیں کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

ہم جہاز جیسے گھر کے کسی بھی کونے کھدرے میں چھپ کر بیٹھ جاتے' نانی ہمیں سرچ لائٹ سے ڈھونڈتی ہوئی حاضر ہو جاتیں۔ نانی کی اس کھوجیوں والی عادت سے ہم بہت الرجک تھے۔ کبھی کبھی تو وہ موقع واردات پہ رنگے ہاتھوں پکڑ کر اپنی مرضی کی ایف۔ آئی۔ آر لکھواتیں اور کڑی سے کڑی سزا نہ صرف خود دیتیں بلکہ اماں کو بھی ورغلاتیں۔

اس زمانے میں ہماری اولین ترین خواہش یہی تھی کہ اے کاش ہماری نانی کے ہاتھوں میں اور کچھ نہیں تو ایک عدد لاٹھی ہی ہوتی۔ جیسے ہی ان کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی دیتی' ہم خبردار ہو جاتے۔ ان حالات میں نانی کے آنے کی پیشگی اطلاع ملنا ناممکنات میں سے تھا۔ اسی لیے وہ چراغ کے جن کی طرح ہمارے چراغ کو رگڑنے کے بغیر ہی حاضر ہو جاتیں۔ اور ہم الہ دین کو کوسنے دیتے رہ جاتے۔

نانی کے اسی مستقل مارشل لاء دور کے دوران ہم نے بچپن کو خیرباد کہہ کر جوانی کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑا۔ یہ بھی ہمیں نانی سے ہی معلوم ہوا کہ ہم خیر سے جوان ہو گئے ہیں۔ کلی سے پھول بن گئے ہیں۔ نانی کا بس نہیں چلتا تھا کہ خوشبو کو قید کر لیتیں۔ اس لیے انہوں نے ہمیں ہی قفس میں ڈالنے پر اکتفا کیا۔ اگر ہم جانتے کہ دورِ جوانی اس قدر دردناک ہو گا تو ہم ہمیشہ بچے ہی رہتے۔

نانی کی چوکیداری بے مثل تھی۔ کیا مجال کہ چڑیا بھی پر مار جائے۔ گھر میں داخل ہونے کے لیے دو دروازے تھے۔ صدر دروازے پر ہمیشہ بڑا سا تالا منہ

چڑا اتا رہتا۔ اور یہ دروازہ دن کے صرف خاص اوقات ہی میں کھلتا۔ گھر میں عام ٹریفک کے لیے صرف ڈیوڑھی کا راستہ بچتا جہاں تخت پوش پہ گاؤ تکیہ لگائے نانی اپنا پھن پھیلائے بیٹھی رہتیں۔ گلی میں سے گزرنے والوں پہ وہ خاص نظر رکھتیں۔ محلے میں تقریباً سبھی گھر عزیزوں، رشتہ داروں کے تھے۔ جہاں کوئی نیا چوکھٹا نظر آتا نانی فکر مند ہو جاتیں اور اگر نووارد کوئی نوجوان ہوتا تو نانی کی تشویش دوچند ہو جاتی۔

نوجوان لڑکیوں کو ڈیوڑھی میں بیٹھنے کی سخت ممانعت تھی۔ البتہ اگر کبھی اچھے موڈ میں ہوتیں تو آواز دے کر بلاتیں اور پاس بٹھاتیں۔ نانی کا یہ متضاد قسم کا رویہ ہمیں بے حد کنفیوز رکھتا۔ مگر جیسے ہی ہم ڈیوڑھی میں قدم رکھتے نانی چق گرا دیتیں۔ ان کے خیال میں بچیوں کو نظر لگنے کا اندیشہ تھا۔ ہم نانی کی خوش فہمی کی داد دیئے بنا نہ رہتے۔ بھلا ان کی موجودگی میں نظر کی کیا مجال کہ ہمیں لگ جاتی۔ ہم نانی کی چوکیداری سے اتنے بیزار تھے کہ الٹا نظر کے گلے پڑ جاتے۔

ہماری سہیلیوں کے ساتھ نانی کا رویہ ایسے ہوتا جیسے وہ ہمارے لیے نامحرم ہوں۔ سکول کے علاوہ سہیلیوں سے ملنا جلنا منع تھا۔ صرف مسکین قسم کی سہیلیوں کو گھر میں قدم رکھنے کی اجازت تھی لیکن اس سے پہلے نانی ان کا پورا شجرہ ازبر کرتیں۔ پسند آتا تو راہداری دیتیں نہیں تو ڈیوڑھی سے ہی واپس کر دیتیں۔

تیز طرار قسم کی سہیلیاں نانی کو سخت ناپسند تھیں۔ ان کے خیال میں اس قسم کی لڑکیاں ایڈونچر کی تلاش میں ہوتی ہیں اور ان کی صحبت ہمارے لیے زہر قاتل تھی۔

جن سہیلیوں کے جوان بھائی ہوتے' وہ بھی ہمارے ہاں آنے سے ڈس کوالیفائی ہو جاتیں۔ نانی کے خیال میں جوان بھائیوں والی سہیلیاں سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔

سہیلیوں کے ساتھ ساتھ نانی ٹیلی ویژن سے بھی سخت بیزار تھیں۔ اس زمانے میں ٹی وی نیا نیا آیا تھا۔ اس لیے نانی صدر ایوب کے سخت خلاف تھیں کہ یہ شیطانی چرخہ ملک میں کیوں داخل ہونے دیا۔ جس کمرے میں ٹی وی تھا' نانی وہاں قدم نہ رکھتیں۔ نانی اگر آج زندہ ہوتیں تو ٹی وی کی حالت زار دیکھ کر اپنی این جی او رجسٹر کرواتیں۔ احتجاجی جلوس منظم کرتیں اور اسے انسانی حقوق کا مسئلہ بنا کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتیں۔

ہمارے خیال میں نانی اگر ٹی وی اور ہماری سہیلیوں کے معاملے میں ہاتھ ہولا رکھتیں تو ان کے بارے میں ہماری رائے اتنے کنفیوژن کا شکار نہ ہوتی۔

لیکن ہماری باتوں سے آپ ہماری نانی کے بارے میں کوئی غلط رائے مت قائم کریں۔ جہاں نانی میں تھوڑی بہت بشری کمزوریاں تھیں' وہیں ان میں بے شمار خوبیاں بھی تھیں۔ ان کی سب سے اچھی خوبی تو یہ تھی کہ وہ کہانیاں بہت اچھی سناتیں۔ نانی کی خود ساختہ کہانیاں کسی فسانہ عجائب سے کم نہ تھیں۔ جب جی چاہتا کہانی کو نیا موڑ دے کر ایک نئی کہانی شروع کر دیتیں۔ کہانی کا انجام معلوم کرنے کے لیے ہم نانی کے رحم و کرم پر تھے۔ اپنی اس پوزیشن کا وہ خوب فائدہ اٹھاتیں۔ جب کبھی ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو ہم نانی سے ناراض ہو جاتے۔ ہنستے ہوئے کہتیں دیکھو چاند میں رہنے والی پریاں تمہیں دیکھ رہی ہیں۔ اچھے بچے

ناراض نہیں ہوتے۔ ہم جل کر جواب دیتے نانی چاند میں پریاں نہیں رہتیں بلکہ وہاں چڑیلیں رہتی ہیں جو ہماری سب باتوں کی رپورٹ تمہیں دیتی رہتی ہیں۔ ہم چاند کو دیکھنے سے بالکل انکار کر دیتے۔ ہماری اس ہٹ دھرمی کا نانی پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر چاند کی طرف اچھال دیتیں۔ گویا چڑیلوں کو بھگا رہی ہوں۔

نانی کے چند معمولات زندگی بھر قائم رہے۔ مثلاً کہانی سنانا' مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا' صدقہ خیرات اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔

مہمانوں کو دیکھ کر یوں خوش ہوتیں جیسے بچے رنگ برنگے کھلونوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں۔ مہمانوں کی بے وقت آمد سے ہماری کہانی میں جو خلل واقع ہوتا وہ ہم سے برداشت نہ ہوتا۔ ہم شکایت کرتے تو ہنس کر کہتیں یہ ہمارے نہیں اللہ کے مہمان ہیں۔ یہ بات ہماری نوخیز عقل میں نہیں سماتی تھی اور ہم منہ بسور کر کہتے اگر اللہ کے مہمان ہیں تو اللہ کے پاس جائیں یہاں کیا کرنے آتے ہیں۔

اللہ کے مہمانوں کا ناشتہ بڑا شاندار ہوتا۔ دیسی سویاں اور انڈوں کا حلوہ ان موقعوں پر بہت اہتمام سے تیار ہوتا۔ خالص دیسی گھی جو ہمیشہ اسٹور میں تالے میں پڑا رہتا' اس دن قفس سے آزاد ہوتا۔ مہمانوں سے محبت کا نقطہ عروج دیسی گھی ہی ہوتا۔ اس زمانے میں ڈالڈا گھی نیا نیا نکلا تھا۔ نانی اس کی سو سو برائیاں کرتیں۔ بناسپتی گھی کی برائیاں سن سن کر ہمیں پورا یقین ہو گیا تھا کہ اسے کھانے والے سب لولے لنگڑے ہو جائیں گے۔ ڈالڈے کا ڈبہ دیکھ کر نانی جھٹ

گھونگھٹ نکال لیتیں جیسے کسی نامحرم کو دیکھ لیا ہو۔

صدقہ خیرات دل کھول کر کرتیں۔ فقیروں کا بہت بے چینی سے انتظار کرتیں۔ جیسے ہی کوئی فقیر گلی میں صدا لگاتا' کسی نہ کسی کو دوڑاتیں کہ اسے پکڑو۔ فقیر اگر تیز رفتار ہوتا اور گھر کے دروازے سے آگے نکل جاتا تو نانی کا موڈ خراب ہو جاتا۔ خیرات دینے کے ساتھ ساتھ اس کی خوب خبر لیتیں کہ بھیک مانگنے نکلے ہو یا اولمپک ریس میں حصہ لینے۔ فقیر ہو تو فقیر بن کر رہو۔ اللہ کے نام پر سوال کرتے ہو اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی چل پڑتے ہو۔ ہمیں اس سے شرمندہ کراؤ گے کہ اس کے نام پر کسی نے کچھ مانگا اور ہم دے نہ سکے۔

صحت مند فقیر کو دیکھ کر نانی کی تیوری پر بل پڑ جاتے۔ کہتیں ہٹا کٹا مشٹنڈا بھیک مانگتا ہے۔ کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتا۔ ایسی سرزنش کرتیں کہ وہ فقیر دوبارہ ہماری گلی کا رخ نہ کرتا بلکہ شہر کے دوسرے صحت مند فقیروں کو بھی خبردار کر دیتا کہ فلاں محلے میں مت جاؤ۔ وہاں احتساب ہوتا ہے۔ ذرا دبو قسم کے فقیر تو چپ کر کے چلے جاتے۔ مگر دل گردے والے نانی سے الجھ پڑتے اور کہتے اماں اگر کچھ دینا ہے تو دو ہماری صحت کو نظر کیوں لگاتی ہو۔ ایسے گستاخ فقیر کو نانی تھانے میں رپورٹ کرانے کی دھمکی دیتیں جس پر کبھی عمل نہ ہوا۔

نانی کے اس سکندرانہ سلوک کی وجہ سے صرف مریل قسم کے فقیر ہی ہمارے محلے میں قدم رکھتے۔ ہر جمعرات کو اپنے بزرگوں کا ختم پڑھ کر بہت بے تابی سے فقیروں کا انتظار کرتیں۔ اگر فقیر لیٹ ہو جاتے تو انہیں باقاعدہ ڈانٹ پڑتی۔ سامنے بٹھا کر کھانا کھلاتیں' پانی پلاتیں اور پھر یوں بھگا دیتیں جیسے وہ بغیر

اجازت ڈیوڑھی میں گھس آئے ہوں۔

نانی کے برعکس نانا بہت کم گو تھے۔ نانی کی ساری سرگرمیوں سے لاتعلق اپنی ہی دنیا میں مگن رہتے۔ نانی کو ان کی خاموشی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ جان بوجھ کر وقفے وقفے سے اس پرسکون تالاب میں کنکریاں پھینکتی رہتیں۔ نئی نئی باتیں نکال کر نانا پر حملہ آور ہوتیں مگر نانا بھی ان کے حملوں سے بچنا خوب جانتے تھے۔

نانی کے مقابلے میں نانا بہت پڑھے لکھے تھے۔ اردو' عربی اور فارسی پر انہیں عبور تھا۔ ہیروں کے کاروبار میں دنیا گھوم چکے تھے۔ اس عمر میں زیادہ وقت موٹی موٹی کتابیں پڑھنے میں گزارتے۔ ان کتابوں کو نانی زندگی بھر اپنی سوت ہی سمجھتی رہیں۔

نانی تو قبول صورت ہی تھیں مگر نانا اس عمر میں بھی یونانی دیوتا لگتے۔ اٹھی ہوئی راجپوتی ناک' کشادہ پیشانی' ذہین آنکھیں' سرخ و سپید رنگت۔ نانا اگر خوش شکل اور پڑھے لکھے تھے تو نانی کو اپنے اونچے نمبردار گھرانے کا بڑا مان تھا۔ بات بات پر بابل کے گھر کے ست رنگے کبوتروں کا ذکر کرتیں اور آبدیدہ ہو جاتیں۔

جب کبھی نانا چپ شاہ کا روزہ توڑتے اس دن بہت گھن گرج کے ساتھ بارش ہوتی۔ ایک ہی کمرے میں اپنے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر لڑتے۔ بہت سے خاندانی حالات ہمیں ان معرکوں کے دوران ہی معلوم ہوئے۔ نانی لڑتے لڑتے تھک جاتیں تو پانی پی کر لیٹ جاتیں۔ ہم سمجھتے کہ سیز فائر ہو گیا مگر نانی تازہ دم ہو کر

پھر گولہ باری شروع کر دیتیں۔ نانی کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ نانا نے آج تک اپنے دل کی گھنڈی نہیں کھولی تھی۔ ہم سمجھتے کہ گھنڈی کوئی چھوٹی موٹی کھڑکی ہو گی جو آج تک نہ کھل سکی۔ یہ دروازہ تو ہرگز نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اگر نانا کے دل کا دروازہ بند ہو جاتا تو نانی پر ان کے گھر کا دروازہ کیسے کھلتا۔

جس دن یہ گھمسان کا رن پڑتا' ہماری کہانی گول ہو جاتی۔ اس دن ہم نانی کے کہے بغیر ہی چاند میں پریاں تلاش کرنے لگ جاتے مگر ہمیں وہاں ہشاش بشاش چڑیلوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا۔ جو ہماری کہانی گول ہونے کی خوشی میں جشن منا رہی ہوتیں۔

خالہ جو ساتھ والے گھر میں رہتی تھیں' اس معرکہ آرائی کے دوران یو۔ این۔ او بن کر بیچ بچاؤ کی کوشش کرتیں تو نانی کی گولہ باری کی زد میں آ جاتیں۔ نانی کو یو۔ این۔ او کی طرح خالہ کے کردار پر بھی شک رہتا۔ ان کے خیال میں وہ نانا کی طرفداری کرتی تھیں' ایسے میں وہ خالہ کی ثالثی کو پوری حقارت سے ٹھکرا دیتیں اور انہیں اپنے ہاں آنے سے بھی منع کر دیتیں مگر شام ہوتے ہی خالہ کو آوازیں دینے لگ جاتیں اور نانا کی سائیڈ لینے پر انہیں برا بھلا بھی کہتی رہتیں۔ نانی کا واویلا سن کر نانا صرف مسکرا کر رہ جاتے۔

نانی ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے بیٹوں سے ملنے داتا کی نگری ضرور جاتیں۔ عجیب اتفاق تھا کہ یہ سرکاری دورہ اکثر لڑائی کے فوراً بعد ہی پلان ہوتا۔ سفر کی تیاری بہت زور شور سے ہوتی۔ ایک دن پہلے ہی اسٹیشن جا کر قلی بک کروا کر آتیں۔ تانگہ استعمال کرنا فضول خرچی سمجھتیں۔ خوب اہتمام سے غسل

ہوتا۔ کہتیں سفر پر انسان کو پاک صاف ہو کر جانا چاہیے۔ کیا پتہ یہ زندگی کا آخری سفر ہو۔ رات کاٹنی مشکل ہو جاتی۔ اٹھ اٹھ کر رات بھر گھڑی دیکھتی رہتیں۔ کہ کہیں بابو ٹرین نہ نکل جائے۔ بابو ٹرین کے علاوہ کسی دوسری ٹرین کو زندگی بھر گھاس نہ ڈالی۔ صبح چار بجے ہی دیسی گھی کے پراٹھے تلے جاتے۔ گھی کی مہک سے سارا گھر جاگ اٹھتا۔ ہم آنکھیں ملتے ہوئے نانی کے پاس رسوئی میں آ بیٹھتے مگر کیا مجال جو پراٹھا ہمیں دے جاتیں۔ نانی کی بھی عجیب منطق تھی۔ کہتیں یہ سفر کا کھانا ہے۔ صرف مسافر کھا سکتے ہیں۔ دو گھنٹے کے سفر میں ساتھ لے جائے جانے والے پراٹھوں کی تعداد دیکھ کر لگتا کہ یہ ساری ٹرین کا ناشتہ ہے۔ جیسے ہی گاڑی اسٹیشن چھوڑتی' پراٹھوں کی پوٹلی کھل جاتی۔ نہ صرف خود مزے لے لے کر کھاتیں بلکہ پاس بیٹھے ہوؤں کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کر کھانے پر مجبور کرتیں۔ یہ سفرنامہ ہم اس لیے لکھ رہے ہیں کہ ہم نانی کے ایک سفر کے چشم دید گواہ ہیں۔ اس کے بعد ہم نے نانی کی ہمراہی سے توبہ کرلی۔

نانی کی پسندیدہ ہابی خاندان کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے تلاش کرنا تھی۔ آپ ہی آپ جوڑ ملاتی رہتیں۔ نانی کے طے کیے ہوئے رشتے کو رد کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ لیکن دونوں فریقوں کی رضامندی کے باوجود بھی اگر بیل منڈھے نہ چڑھتی تو اللہ کی مرضی کہہ کر خاموش ہو جاتیں۔ شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکے لڑکیوں کی رضامندی معلوم کرنا شان کے خلاف سمجھتیں۔ جہاں کسی لڑکے لڑکی کو آپس میں بات کرتے دیکھا' ان کا تخیل لوٹ پوٹ ہو جاتا اور اسے رضامندی ہی سمجھ لیتیں۔

البتہ خاندان سے باہر سے آنے والے رشتوں کو بیک جنبش قلم رد کر دیتیں ان کے خیال میں انسانی نسلیں اسی طرح زوال پذیر ہوئی ہیں۔ خالص خون کی اصطلاح بہت شد و مد سے استعمال کرتیں، جو کبھی ہمارے پلے نہ پڑی۔ غرضیکہ نانی کا بس نہیں چلتا تھا کہ خاندان کے سبھی لڑکے لڑکیوں کی ایک ہی دن میں اجتماعی شادی کروا کر نگرانی کی مشقت سے بچ جاتیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ نانی کھلی کتاب تھیں۔ اندر باہر سے ایک، مگر نانی نے ہم سے زندگی بھر ایک بات چھپائے رکھی۔ یا شاید بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ جس دن نانی کا انتقال ہوا یہ خبر ہم پر ایٹم بم بن کر گری کہ وہ ہماری نانی نہیں بلکہ پرنانی تھیں۔ یعنی گریٹ گرینڈ مدر۔ سچ پوچھئے تو ہمیں زندگی میں پہلی بار خاموش لیٹی ہوئی نانی پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

ہر چند زمانہ گھائل ہے، چھلنی ہے جگر سب دنیا کا

پر جس کا نہیں ہے کوئی نشاں وہ چوٹ سبھی نے کھائی ہے

(قتیل شفائی)

باؤنسر

میڈیا کی اہمیت سے کوئی فاتر العقل ہی انکار کر سکتا ہے۔ اس کی روز افزوں ترقی اور نت نئی ایجادات نے تو اچھوں اچھوں کو چکرا کر رکھ دیا ہے۔ عام آدمی کو تو اس کا جو بھی فائدہ ہوا ہے' اس سے قطع نظر زندگی کے چند شعبے اس سے بہت فیض یاب ہوئے ہیں جن میں خاص طور پر سیاست' اسپورٹس اور شو بزنس قابل ذکر ہیں۔

ان تمام شعبوں میں گلیمر کے علاوہ ایک اور قدر مشترک بھی ہے۔ یہاں جتنی تیزی سے لوگ اوپر آتے ہیں' اتنی ہی تیزی سے نیچے کی طرف دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ گلیمر اور شہرت کی اس فضا میں توازن برقرار رکھنے کے لیے بندے کے لیے اپنے شعبے میں مہارت کے علاوہ اچھا کھلاڑی ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ دگرنہ نیوٹن کے قانون کی زد میں آنے سے بچنا مشکل ہے۔ ایک بار بندہ زمین پر گر جائے تو پھر گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ کیونکہ ان شعبوں میں کسی گرے ہوئے کو

اٹھانے کا رواج کم ہی ہے۔ انہی شعبوں پر کیا موقوف ہے، گرے ہوؤں کو اٹھانے کا جھنجٹ پالنے کی تکلیف ہم کرتے ہی نہیں۔

ان تینوں شعبوں کے افراد میں ایک اور خاص خوبی پائی جاتی ہے اور وہ ہے باؤنسر مارنے کی عادت۔ آپ کہیں گے کہ بھئی باؤنسر تو صرف کھلاڑی مارتے ہیں لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ کھلاڑیوں کے باؤنسر مارنے پر تو ان کی سرزنش ہوتی ہے لیکن اگر اناڑی باؤنسر مارنا شروع کردیں تو آپ کسی عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتے۔

باؤنسر مارنے کی پاداش میں بیچارے کھلاڑی تو سزا بھگتتے ہیں لیکن سیاست دانوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ کھلاڑیوں کی طرح ضابطوں کے پابند نہیں ہوتے۔ انہیں خود تو کم ہی باؤنسرز پڑتے ہیں لیکن یہ عوام کو زیادہ باؤنسر مارتے ہیں۔ اگر کبھی کبھار انہیں باؤنسر پڑ بھی جائیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہ جلدی سے پارٹی بدل لیتے ہیں۔ نعرہ بدل دیتے ہیں اور کچھ نہیں تو پارٹی کا نام ہی بدل لیں گے۔ منشور بدل لیں گے۔ گویا پرانی بوتلوں میں نئی شراب بھریں گے مگر کام وہی کریں گے جو پہلے کر رہے تھے۔ ویسے یہ نیک کام ہمارے سیاست دان ہی کرسکتے ہیں۔ برطانیہ کے سیاست دان اتنے جرات مند نہیں ہیں۔

باؤنسر کھانے کے لیے بندے کا ڈھیٹ ہونا بہت ضروری ہے اور یہ خوبی سیاست دانوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ نئے نئے نعروں سے عوام الناس کو باؤنسر مارتے ہیں۔ اب تو ہمارے گداگر بھی سیاست کرنے لگ گئے ہیں۔ ایٹمی دھماکے کے بعد انہوں نے بھی بھیک مانگنے کے روایتی سلوگن بدل دیئے ہیں۔

اب وہ ایٹم بم کے نام پر خیرات مانگتے ہیں۔ "بی بی ایٹم بم کی خیر ہو۔ پاکستان کی خیر ہو۔ ایٹم بم کے نام پر کچھ دیتی جاؤ"۔

ایٹم بم سے ہمارے ملک کو کوئی اور فائدہ ہوا ہے یا نہیں مگر ایک فائدہ ضرور ہوا کہ زندگی میں پہلی بار پاکستان کا نام مغربی میڈیا پر بہت نشر ہوا۔ پردیس میں اتنے سالوں بعد جی خوش ہو گیا کہ کسی مثبت حوالے سے ہمارے وطن کا نام ان زبانوں پر آیا تو' جو دن رات کرپشن' بھوک' بیماری' جہالت اور دہشت گردی کے حوالے سے ہی ہمارے وطن کا نام اچھالتے رہتے تھے۔

پاکستان میں ایٹمی دھماکوں کے فوراً بعد سی۔ این این پر ایک دستاویزی فلم دکھائی جارہی تھی جس میں ایک غریب پاکستانی عورت روٹی پکاتے ہوئے کہہ رہی تھی "ہم بھوکے رہ لیں گے مگر ایٹم بم ضرور بننا چاہیے" ہم اس خاتون کے جذبہ حب الوطنی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ دیار غیر میں بیٹھ کر پہلی بار انکشاف ہوا کہ اب ہمارے ملک کی غربت میں پسی ہوئی عام گھریلو عورت بھی کچھ باشعور ہو گئی ہے اور یہ سب میڈیا کا کمال ہے۔ لیکن ابھی اس نوزائیدہ شعور کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے تاکہ آنے والے وقتوں میں یہ جوان ہو کر لوگوں کو اپنے مستقبل کے صحیح فیصلے کرنے میں مدد دے سکے اور وہ آئے دن کے باؤنسروں سے بچ سکیں۔

کھیل اور سیاست میں ادھ موا کرنے کے بعد باؤنسرز اپنی شعبدہ بازیاں دکھانے کے لیے شو بزنس میں آدھمکتے ہیں۔ فلم ہمارا میدان نہیں ہے کیونکہ ہمیں اوور ایکٹنگ کرنا نہیں آتی۔ صرف نیچرل ایکٹنگ کر سکتے ہیں اور فلموں میں

اس قسم کی ایکٹنگ کا سکوپ بہت کم ہے۔ہاں البتہ صدا کاری سے ہمیں قلبی لگاؤ ہے۔ حیوان ناطق ہیں اس لیے بولنے پر مجبور ہیں۔اب جب بولنا ہی مقدر ٹھہرا تو کیوں ناں اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ ہوا کے دوش پر لفظوں کی پھلجھڑیاں' آواز کے زیر و بم کے ساتھ چھوڑنے والوں کو پریزنٹرز یعنی اناؤنسرز کہا جاتا ہے۔ مگر ہم انہیں باؤنسرز بھی کہتے ہیں۔

اب آپ کہیں گے کہ اناؤنسر اور باؤنسر کا کیا رشتہ ہے۔ بھئی بہت گہرا رشتہ ہے۔ صرف غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دراصل یہ خود تو باؤنسرز نہیں مارتے بلکہ انہیں باؤنسرز پڑتے رہتے ہیں۔اناؤنسرز کو جس مائیکروفون کے آگے بٹھایا جاتا ہے اس کی شکل مکے سے ملتی جلتی ہے۔ہمارے خیال میں یہ اناؤنسرز کو ڈرانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ذرا زبان پھسلی اور سیاہ دستانے میں لپٹا ہوا مکا پڑا اناؤنسر کی ناک پر۔ ستم بالائے ستم کہ اناؤنسرز کو اس مشق ستم کے لیے تن تنہا بند کمرے میں بٹھایا جاتا ہے۔ صرف ایک شیشے کی دیوار ہوتی ہے جس سے لوگ اناؤنسر کی حالت زاد دیکھ کر دور ہی سے ہاتھ ہلاتے رہتے ہیں۔ہمارے خیال میں تو اناؤنسرز کو کال کوٹھڑی میں اس لیے بند کیا جاتا ہے کہ کمزور دل والے کہیں اٹھ کر بھاگ نہ جائیں۔ محاورے کی رو سے ملا کی دوڑ صرف مسجد تک ہوتی ہے اور کہیں چلا بھی جائے تو مس فٹ ہو جاتا ہے۔اسی طرح اناؤنسر بھی زیادہ سے زیادہ اسٹوڈیو کے دروازے تک ہی آ سکتا ہے۔ کیونکہ پروگرام پروڈیوسر آگے مکا تانے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ جب اناؤنسر منہ کھولتا ہے تو (چاہے جمائی لینے کے لیے ہی ہو) آن ایئر کا خون میں نہایا ہوا سرخ سائن جگمگ جگمگ کرنا

شروع کر دیتا ہے۔ اس ریڈ الرٹ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ باملاحظہ، ہوشیار۔ اگر کوئی الٹی سیدھی بات کی تو باؤنسرز پڑ جائیں گے۔

اس کے برعکس کچھ اناؤنسرز مائیکروفون کو باؤنسر مارتے ہیں۔ اس کالے کلوٹے مکے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بڑے دھڑلے سے آکر بیٹھتے ہیں۔ اس وقت یہ مکا سمٹ کر پرے ہٹ جاتا ہے۔ بھئی زمانہ ہی ایسا ہے۔ دنیا ڈرنے والوں کو اور ڈراتی ہے بلکہ دھمکاتی ہے۔ شرافت کو کمزوری پہ محمول کیا جاتا ہے۔ مکا بے جان سہی مگر ہماری ہی دنیا کی مخلوق ہے۔ سبق کیسے نہیں سیکھے گا۔ دراصل یہ اناؤنسرز اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ مکے سے ان کی دوستی ہوتی ہے یا مکا دوستی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر ۔

کیا مصلحت شناس تھا وہ آدمی قتیل
مجبوریوں کا جس نے وفا نام رکھ دیا

موبائل ٹیلی فون اور موبائل لائبریریوں کی طرح کچھ موبائل اناؤنسرز بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم گشتی اناؤنسرز کہہ سکتے ہیں۔ یہ گھومتے پھرتے اناؤنسرز کبھی تو گھر سے سودا سلف لانے کے لیے نکلتے ہیں۔ راستے میں یاد آگیا کہ آج تو پروگرام کرنا تھا، سب شاپنگ بھول کر ہانپتے کانپتے اسٹوڈیو پہنچتے ہیں۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ جیسے ہی قید تنہائی میں گئے، مکا بھی ان کی خبرگیری کے لیے تیار بیٹھا ہوتا ہے۔ ایسے اناؤنسرز کی نہ صرف ریڈیو انتظامیہ بلکہ عوام الناس بھی خوب خبر لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ بغیر تیاری کے ہی ہوا کے دوش پر اڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

کچھ اناؤنسرز ضرورت سے زیادہ ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات بات پر ہنسیں گے۔ چاہے عام زندگی میں سڑے کریلے کی طرح ان کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہ آئی ہو مگر مکے کے سامنے بیٹھ کر وہ باب ھوپ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک پتے کی بات بتائیں آپ کو۔ ایسے اناؤنسروں کے فین بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم کبھی سیلنگ تو کبھی پیڈسٹل فین کہتے ہیں۔ ہینڈ فین اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ان کا رواج اب کم ہوگیا ہے۔ یہ ضرورت سے زیادہ ان کی تعریفیں کرکر کے دوسروں پر ان کی قابلیت کا رعب جماتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے پنکھوں کو باقاعدہ ترغیبات دی جاتی ہیں تاکہ وہ باقاعدگی سے پروگرام میں فون کرکے اناؤنسرز کی نالائقی کا بھرم رکھیں۔

اناؤنسرز کی ایک قسم گھبراتے' شرماتے اور لجاتے اناؤنسرز کی بھی ہوتی ہے۔ یہ عام زندگی کے علاوہ مکے کے سامنے بیٹھ کر بھی شرمانے کی ایکٹنگ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اس نازیبا حرکت پر مکا طیش میں بھی آسکتا ہے۔

شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھنے والوں کو ہم ندیا کے پار والے بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ پروڈیوسرز کی کشتی میں ہچکولے کھاتے رہتے ہیں۔ جو چپو لیے ان کے سر پر کھڑے رہتے ہیں۔ ایسا شاید ہمارے وطن میں کم مگر بیرون ملک چلنے والے ایشیائی ریڈیو اسٹیشنوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ اناؤنسرز کو ملنے والی ہدایات کچھ یوں ہوتی ہیں "ایسے بیٹھو' اس طرح مت بولو' تھوڑا ہنسو' اتنے انڈین گانے لگاؤ' ملی نغمے' اور وہ بھی پاکستان کے بالکل نہ لگاؤ۔ (کہیں وطن کی یاد میں جذباتی ہوکر لوگ

ریڈیو اسٹیشن کا گھیراؤ نہ کرلیں) صرف چند پاکستانی گانے لگاؤ اور ساتھ یہ بھی اناؤنس کرو کہ یہ پاکستانی گانا ہے۔ (انڈین گانوں سے تو ساری دنیا واقف ہے ان کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے) نعت بالکل نہیں لگانی۔ اس پروگرام میں اتنے پاکستانی کالرز کیوں تھے' ڈسکشن پروگرامز میں صرف بدھو قسم کے پاکستانی کالرز لو' جو صرف تعریف ہی کریں اور کوئی ڈھنگ کی بات اپنے ملک اور قوم کے حق میں نہ کرسکیں۔ ہوشیار قسم کے پڑھے لکھے پاکستانی کالرز اگر لو تو وقت بہت کم دو وغیرہ وغیرہ۔

چند گھنٹے کے پروگرام میں ہی اناؤنسر اتنے باؤنسرز کھا چکا ہوتا ہے کہ اگلے پروگرام تک ڈپریس رہتا ہے۔ ایک راز کی بات بتاتے ہیں۔ جب کوئی اناؤنسر گانے پر گانے لگاتا چلا جائے تو سمجھیں معاملہ گڑبڑ ہے۔ یا تو سکرپٹ گھر چھوڑ آئے یا پھر پروڈیوسر سے ڈانٹ کھا رہے ہیں۔ نصرت فتح علی اور پٹھانے خان کے لمبے لمبے دردناک گانے لگا کر وہ اپنے غم کو غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میڈیا سے وابستہ اتنی بدحواسیوں اور رنگینیوں کے باوجود بیرون ملک ہمارے لوگ اس شعبے میں کم ہی آتے ہیں۔ بس ایک ہی دھن ہے کہ کسی طرح ڈاکٹر' انجینئر' وکیل یا اکاؤنٹنٹ بن جائیں۔ یہ میدان پڑوسی ملک کے ہاتھ میں دے کر ہمارے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھے نسلی تعلقات کو فروغ دے رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں تو نسلی تعلقات فروغ نہیں پا رہے ہوتے بلکہ ان کی اپنی نسل تباہ ہو رہی ہوتی ہے جس کا انہیں احساس ہی نہیں ہوتا۔ ریڈیو ہر وقت ایک ہی راگ الاپتے رہتے ہیں "ہم ایک ہیں۔ ہم ایک ہیں" مذہب اور قوم کا ذکر گول کر دیا

جاتا ہے اور اگر ذکر ہوتا بھی ہے تو مدر انڈیا کا۔ اور پاکستان تو جیسے غلطی سے دنیا کے نقشے پر ابھر آیا ہے۔ اپنے قومی تشخص' مذہب' زبان اور تہذیب سے اس طرح کی مجرمانہ غفلت کرنے والے لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ بھائی بھائی کی سازش کا شکار ہو کر ہم کس منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ اگر اب بھی ہم نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو اتنے باؤنسرز پڑیں گے کہ خود اپنی صورت پہچاننی مشکل ہو جائے گی۔

ہم نئی جس کو سمجھ بیٹھے ہیں
یہ نئی دنیا بھی باسی ہے بہت
(فرحت عباس شاہ

آگئی

مضمون کے عنوان سے کوئی غلط مطلب اخذ نہ کریں۔ آگئی دراصل اردو زبان کے خوبصورت لفظ آگہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں اسے آگہی ہی کہتے ہیں مگر برطانیہ میں کچھ لوگ اسے آگئی کہتے ہیں۔

دراصل بگاڑ ہمارے کلچر کا اتنا اہم جزو بن چکا ہے کہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ اب خالص نظر نہیں آتا۔ ایسے میں اگر آگہی کو آگئی بنادیا گیا ہے تو کچھ زیادہ حیرت کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے بھی اس دنیا میں آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ اگر ایک مرتبہ آنے والے یہاں سے رخت سفر نہ باندھیں تو نئے آنے والوں کو بیٹھنے تو کجا کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ ملے لیکن آمدورفت کے اس چکر میں آگہی کی حیثیت بہت منفرد اور مسلم ہے۔ اول تو یہ آتی ہی مشکل سے ہے اور جب ایک مرتبہ آجائے تو پھر اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی آگہی کے بارے

میں پروین شاکر نے کہا تھا کہ "آشوب آگہی سے بڑا عذاب آج تک زمین والوں پر نہیں اترا۔ یہ اس شہر ذات سے روشناس کرواتی ہے جس کے سب دروازے اندر کی طرف کھلتے ہیں اور واپسی کا راستہ نہیں ہوتا"۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ آگہی بیگم خاصی ڈھیٹ واقع ہوئی ہیں۔ اس کی ہٹ دھرمی کے کرشموں سے تو وہ ہی لوگ واقف ہیں جن کے دل و ذہن کو آگہی کا چار سو چالیس وولٹ کا بلب اس طرح روشن کرتا ہے کہ انہیں فارسی زبان کی یہ کہاوت کہے بنا چارہ نہیں ہوتا "آمیری طبیعت کی روشنی تو میرے لیے بلا بن گئی ہے"۔

ویسے آگہی کو بلا کہنے والے بھی اپنی جگہ درست ہیں کیونکہ جسے جس بات کی آگہی ہو جاتی ہے، عوام الناس اس روشنی سے اپنے قلب وجاں منور کرنے کے لیے اس شخص کی جان عذاب میں کر دیتے ہیں۔ اب ہونا تو یوں چاہیے کہ آگہی کی روشنی کو دل و ذہن کے تاریک آنگن میں اتارنے کے لیے سب اپنے اپنے حصے کا ہوم ورک کریں مگر ہمیں پکا پکایا کھانا کھانے کی ایسی منحوس عادت پڑ گئی ہے کہ کچن میں جا کر چولہے کی تمازت سے چہرہ جھلساتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

ہماری ناقص رائے میں تو آگہی کا ہونا بھی مصیبت اور نہ ہونا اس سے بڑی مصیبت ہے۔ لیکن یہ دونوں مصیبتیں بھی ان لوگوں کے کھاتے میں لکھ دی جاتی ہیں جنہیں آگہی ہوتی ہے اور آگہی سے کورے لوگ ہلکے پھلکے ہو کر زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ اس سارے کھیل میں سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو وہ ہوتا ہے جہاں لوگ آگہی نہ ہونے کے باوجود اپنی بات منوانے کے لیے ہٹ

دھرمی کا ایسا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ان کی اس جہالت پر سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔

خیر جانے دیں۔ ایسی باتوں پر غصہ نہیں کرتے۔ ہمارے مذہب میں غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس ہیجانی کیفیت میں لوگ اول جلول قسم کی حرکات کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ حرکات و سکنات دیکھ کر شاید غصے کو بھی شرم آجاتی ہو گی مگر غصہ کرنے والوں کو کوئی ندامت نہیں ہوتی۔

مگر کیا کریں۔ بات بات پر جذباتی ہو جانا ہمارا نیشنل سمبل بن چکا ہے۔ نارمل یعنی شریفانہ لہجے میں بات کرنا بزدلی کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ جب تک پنجابی فلموں والی ٹھاہ ٹھوں نہ ہو، ہمیں لگتا ہے کہ ہماری بات دوسرے کے گوش گزار ہی نہیں ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ چاہے مدمقابل کے کان کے پردے پھٹ چکے ہوں۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوتی دیکھ کر طیش میں آجانا ایک نارمل حرکت ہے لیکن آپ یہ مت سمجھیں کہ اس حالت میں سب لوگ تخریبی یا تادیبی ردعمل کا مظاہرہ ہی کرتے ہیں۔ کبھی کبھار تو لوگ غصے میں بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں جو غصہ کیے بغیر ممکن ہی نہ تھے۔

دراصل غصے کی حالت میں بندے کے اندر جو انرجی پیدا ہوتی ہے، اسے صحیح سمت میں چینل کرنے اور کسی مثبت یا تعمیری کام کے کرنے کے لیے بندے کے اندر نظم و ضبط یعنی انرڈسپلن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کسی ایسے ہی گرماگرم لمحے میں ہم نے بھی اپنے غصے کا رخ تخریب کی بجائے تعمیر کی طرف موڑ کر چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ لفظ دوست سے آپ حیران نہ ہوں۔ انسانوں کی یہ جنس برطانیہ میں بھی پائی جاتی ہے مگر جن دوستوں کا ذکر ہم

کرنے جا رہے ہیں' وہ صحیح معنوں میں دوست ہی تھے۔ اس قسم کے دوست ہر جگہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان کی اصل پہچان یہ ہوتی ہے کہ یہ باتیں زیادہ اور کام کم کرتے ہیں۔ بلکہ بالکل ہی نہیں کرتے۔ قوم کا درد ان کے دل میں رہ رہ کر اٹھتا ہے۔ ایسے میں یہ ہسپتال جانے کی بجائے کوئی تنظیم بنانے کی طرف دوڑتے ہیں۔ اپنی کمیونٹی کی زبوں حالی اور ہم وطنوں کی بے حسی پر انہیں بہت غصہ آتا ہے۔

ہمارے ان دوستوں کا موقف یہ تھا کہ برطانیہ میں دوسری کمیونیٹیز کے لوگ تو بہت منظم ہیں مگر ہماری کمیونٹی ہر وقت دھینگامشتی میں لگی رہتی ہے۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ کمیونٹی کم از کم مصروف تو ہے ناں۔ اچھے نہ سہی' کسی برے کام میں ہی سہی۔ فارغ تو نہیں بیٹھے۔ ویسے بھی کمیونٹی کی خدمت کے لیے جس قسم کے اوصاف حمیدہ کی ضرورت ہوتی ہے' وہ جراثیم ہمارے اندر نہیں پائے جاتے۔ ہمارے پرسنل ایجنڈے ہر میدان میں سبقت لے جاتے ہیں۔ اور بے چاری کمیونٹی منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ آپ ہی انصاف کریں کہ اپنے ہم وطنوں کو ایسے صدموں سے دوچار کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ بیچارے تو پہلے ہی وطن چھوڑنے کا صدمہ' عزیزوں سے بچھڑنے کا دکھ' نئی زمینوں پر پنپنے کا عذاب' نسلی تعصب' بے روزگاری اور بے مہر ہواؤں میں پلنے والے اپنے بچوں کے مسائل سے ہی ادھ موئے ہو چکے ہوتے ہیں اور مرے کو مارے شاہ مدار۔

آپ یقین کریں کہ ہماری کوئی دلیل کام نہ آئی اور ہمارے ان دوستوں نے ایک نئی تنظیم کی بنیاد رکھنے کے حق میں ایسے ایسے دلائل دیئے کہ ہم خاموش

ہو گئے۔ سب سے وزنی دلیل جو ہمارے سر پر پتھر کی مانند آ کر لگی، وہ یہ تھی کہ دنیا امید پر قائم ہے۔ انسان کو اتنا بھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ کیا ہوا اگر ابھی ہم ان اوصاف سے محروم ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تنظیم کی بنیاد رکھنے کے بعد یہ اوصاف ہم میں پیدا ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی کمیونٹی کی قسمت بھی سنور جائے اور وہ سر پھٹول چھوڑ کر خدمت خلق کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ واہ رے خوش فہمی۔

ہمارے خیال میں ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے کسی نہ کسی فہمی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر خوش فہمی نہ ہو تو پھر غلط فہمی ہوتی ہے جو خوش فہمی سے زیادہ مضر ہو سکتی ہے۔ کسی بھی قسم کی فہمی کے لیے کسی مثبت یا منفی سوچ یا نظریے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وگرنہ سوچ بچار کے بغیر فہمی قسم کی کوئی بھی چیز کج فہمی بن جاتی ہے۔ اور زندگی زیادہ دیر تک کج فہمیوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔

بوجھ سے یاد آیا کہ ہمارے ایک عزیز کافی عرصے سے مجرد زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے خیال میں شادی کرنے اور پھر نبھانے کا بوجھ کون برداشت کرے۔ شادی نبھانے سے پہلے ہی صرف شادی کرنے کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں کہ بندہ اکیلا ہی بھلا۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ پاپڑ بیلنے کی بجائے کچوریاں تلا کریں۔ تو شاید معاملہ بن جائے۔ کیونکہ ان کی موجودہ حالت کو دیکھ کر تو صرف کوئی اندھی لڑکی ہی ان سے شادی پر رضامند ہو گی۔ ہماری یہ ہمدردی ہمیں بہت مہنگی پڑی اور وہ ذات شریف تاحال ہم سے ناراض ہیں۔

بات تو تنظیم کی ہو رہی تھی۔ یہ ہم شادی کے چکر میں کہاں پڑ گئے۔ ویسے شادی کرنے اور تنظیم بنانے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ شادی میں دو فریق

پورے ہوش وحواس کے ساتھ ایک شرعی بندھن میں باندھے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر سب ہی خوش ہوتے ہیں۔ چاہے یہ دونوں سب سے زیادہ ناخوش ہوں۔

تنظیم کا معاملہ کچھ یوں ہے کہ اس میں تنظیم بنانے والوں کے علاوہ سب ہی ناخوش ہوتے ہیں۔ ہماری ایک دوست کا خیال ہے کہ جس دن سب ہی لوگ ایک بات پر متفق ہو کر خوش ہو گئے اس دن سورج خوشی کے مارے زمین پہ آ گرے گا۔ اس لیے قبل از وقت قیامت بلانے سے بہتر ہے کہ کچھ لوگ ناخوش ہی رہیں۔

خیر تنظیم کی بسم اللہ کے لیے ایک زبردست گول میز کانفرنس ہوئی اور کوئی اچھا سا نام رکھنے کے لیے تخیل کے گھوڑے سرپٹ دوڑائے گئے۔ کچھ خواتین کا خیال تھا کہ بزم ادب یا انجمن خواتین ٹائپ کا نام ٹھیک رہے گا۔

بزم ادب جیسے بھاری بھرکم نام سے ہمیں سخت وحشت ہوتی ہے۔ کیونکہ جیسی بے ادبی اور جیسی جیسی ریشہ دوانیاں ہم نے ادب کے نام پر ہوتی دیکھی ہیں، زندگی کے دوسرے شعبے اس رونق سے محروم ہیں۔ ویسے بھی اردو کو یتیم زبان کہا جاتا ہے اور جس یتیم سے کسی فائدے کی امید ہو اس کے سب ہی سرپرست بن جاتے ہیں۔ ادب کی دوڑ میں سبقت لے جانے کے لیے کچھ لوگ تہذیب وشائستگی کو بالائے طاق رکھ کر اخلاقی حدود وقیود یوں پھلانگتے ہیں کہ ریس میں دوڑنے والا اچھے سے اچھا گھوڑا بھی میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔

بزم ادب جیسے نام سے ہمیں زمانہ طالب علمی کی بو آتی تھی، جب ہم اسکول کی اسمبلی میں ادھ کھلی آنکھوں سے لہک لہک کر "لب پہ آتی ہے دعا بن

کے تمنا میری" گایا کرتے تھے لیکن اس عمر میں گرد و پیش کے حالات دیکھ کر لرزتے ہوئے ہونٹوں پہ دعا کی بجائے آہ و فغاں ابھرتی ہے۔

انجمن خواتین جیسا نام ہمیں خواتین کی ذات پر الزام تراشی لگتا تھا کیونکہ خواتین تو اپنی ذات میں خود انجمن ہوتی ہیں۔ اس قسم کے ناموں سے ان کی توہین کیوں کی جائے۔ بھلا خواتین کو انجمن بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں چند خواتین سر جوڑ کر بیٹھیں، ایسی ایسی موشگافیاں، ایسے ایسے ہنگامے کہ زبانوں سے ٹپکتا ہوا رس دیکھ کر شہد کی مکھیاں بھی چھتہ چھوڑ جائیں کہ اب لوگوں کو ان کے شہد کی ضرورت نہیں رہی۔

ہماری دوستوں کا خیال تھا کہ شادی چلانے کی نسبت تنظیم چلانا زیادہ مشکل کام ہے۔ شادی میں تو صرف شوہر اور اس کے گھر والوں کی گھرکیاں ہوتی ہیں جبکہ تنظیم چلانے کے لیے ہر کس و ناکس کی کڑوی کسیلی باتیں سننا پڑتی ہیں۔ خدمت خلق کے ذکر پہ لوگ عجیب عجیب نظروں سے گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ جیسے انہیں ہماری صحیح الدماغی پر شک ہو۔ ایسے ایسے ریمارکس سننے کو ملتے ہیں کہ ہزار بار خدا کی قدرت کے قائل ہونے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے کیسی کیسی چیزیں بنا کر اس زمین پر چھوڑ دی ہیں۔

ہم نے اپنی دوستوں کو تسلی دی کہ دنیا کا کام تو کہنا ہے۔ سو وہ کہتی رہے گی۔ آپ صرف تنظیم کی فکر کریں۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد قرعہ فال "آگہی" کے نام پڑا۔ کچھ خواتین کا خیال تھا کہ آگہی مشکل نام ہے اور عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ وہ اسے آگہی کی بجائے آگئی سمجھیں گی۔ ہم نے کہا یہ تو ادر

بھی اچھی بات ہے کہ آگہی اتنی جلدی آ گئی۔ ویسے جنہیں زیادہ مشکل پیش آئے گی تو انہیں سمجھا دیں گے۔ آخر آگہی کا مقصد بھی تو سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہی ہے۔
ہماری اس دلیل نے سب کو خاموش کرا دیا اور یوں دوستو! آگہی بقول کچھ لوگوں کے آ گئی اور ایسی آئی کہ بس آ ہی گئی۔

تھے اچھے بے سر و سامانیوں میں
پڑی ہیں مشکلیں آسانیوں میں
(شبنم شکیل)

چھوٹی ی کی کرشمہ سازیاں

ہماری ایک دوست کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کے ناموں کے آخر میں چھوٹی ی ہوتی ہے، ان سے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ہم نے ان کی اس تھیوری کو ماننے سے یکسر انکار کر دیا۔ کیونکہ کسی تھیوری یا فارمولے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ٹھوس حقائق کی ضرورت ہوتی ہے وگرنہ لوگ تو بہت کچھ کہتے رہتے ہیں۔ اب ہر بات کو سچ تو نہیں مانا جا سکتا۔ ہماری اس ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے ہماری دوست نے اپنی تھیوری کے حق میں ایسے ایسے دلائل دیئے کہ ساری دنیا کے سائنس دان انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔

بقول ان کے لفظ منگنی کو ہی لے لیجئے۔ اس کی قید میں آنے والے کو منگیتر اور آنے والی کو منگیتری کہا جاتا ہے۔ ہم نے احتجاج کیا کہ منگیتری کوئی لفظ نہیں ہے۔ کہنے لگیں ہماری لغت میں ہے۔ اگر کبوتر کی کبوتری ہو سکتی ہے تو منگیتر کی منگیتری کیوں نہیں ہو سکتی۔ ہم نے پھر منہ کھولا کہ منگنی کسی کا نام تو نہیں ہے۔ یہ

تو محض ایک لفظ ہے۔ کہنے لگیں آپ صحیح کہتی ہیں مگر ہمارے ہاں یہ ایک بہت بڑے سماجی معاہدے کا نام ہے۔ اگرچہ اس کی جڑیں ہندو تہذیب میں پیوست ہیں لیکن بہت سی دوسری رسوم کی طرح برصغیر میں صدیوں اکٹھے رہنے کی وجہ سے ہم نے اس قبیح رسم کو بہت اہم درجہ دے رکھا ہے۔ گو کہ اسلام میں منگنی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

ان کی دلیل سن کر ہم کچھ خاموش تو ہو گئے مگر پھر سوال داغ دیا کہ چلیں اس کے آخر میں ی تو ہے مگر اس کا خطرناک ہونا کہاں سے ثابت ہوتا ہے۔ ہنس کر کہنے لگیں کہ آپ اب لائن پر آئی ہیں۔ دیکھئے جی منگنی شادی سے پہلے ہی ٹینشن کا نام ہے۔ اس کے ہونے پر غیر ضروری اخراجات' نمود و نمائش' لڑکے اور لڑکی کا ایک دوسرے سے وقت سے پہلے ہی ضرورت سے زیادہ واقفیت حاصل کر لینا اور ساتھ ہی اہل خانہ کا ایک دوسرے کی اچھائیوں سے کم اور کمزوریوں سے زیادہ واقف ہو جانا۔ کبھی کبھی تو اس قدر ٹینشن پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ اٹین شن ہو کر سلوٹ مار کر نکل جاتے ہیں۔

دیکھیں ناں اب اگرچہ چھوٹی ی والی چیز سرے سے ہی نہ ہو اور سیدھے سیدھے شادی کر دی جائے تو سب خوبیاں خامیاں بعد میں کھلیں گی اور جب اوکھلی میں سر دے دیا تو موسلے تو کھانے ہی پڑیں گے۔ ان کی دلیل میں کچھ جان پڑتی دیکھ کر ہم نے پوچھا کہ چلیں یہ تو ایک قباحت ہوئی۔ اب اتنی سی بات کے لیے اس قدر پر رونق سماجی تقریب کو سرے سے ختم تو نہیں کیا جا سکتا۔ آخر خواتین کے لیے زیورات اور کپڑوں کی نمائش کے چند مواقع تو ہونے ہی چاہئیں

اور کچھ خواتین تو جیتی ہی زیورات اور کپڑے بنوانے اور رنگانے کے لیے ہیں۔ ذرا سوچیے ان کی زندگی کس قدر پھیکی ہو جائے گی۔ کہنے لگیں ایسی خواتین کو چاہیے کہ فارغ وقت میں سماجی فلاح و بہبود کے کام کیا کریں۔ مطالعہ کیا کریں تاکہ ان کے تاریک ذہن روشن ہو جائیں۔

ہم نے کہا منگیتروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگیں منگیتر دنیا کی مظلوم ترین مخلوق ہوتے ہیں۔ اور خاص طور پر وہ منگیتر جو برطانیہ کا رخت سفر باندھتے ہیں۔ ہم نے کہا اس میں مظلوم ہونے کی کیا بات ہے۔ گلی محلوں میں گلی ٹلے مارتے، ہوائی جہاز کی سیر کرتے وہ دنیا کے مصروف ترین ایئرپورٹ پر شان سے اترتے ہیں اور کیا چاہیے انہیں۔ کہنے لگیں یہی تو بات ہے۔ منگیتر ایک بار جب جہاز سے نیچے اترتا ہے تو پھر وہ پاتال میں اتر جاتا ہے۔ اس کے ابھرنے کی صورت مشکل سے ہی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی منگیتری اور اس کے گھر والوں کے احسان تلے یوں دب جاتا ہے کہ زندگی بھر سر جھکا کر شکریہ کا ورد کرتا رہے پھر بھی کم ہے۔ اور اگر کوئی باغی قسم کا من چلا منگیتر احسان فراموش بننے کی کوشش کرے تو اسے پھانسی کے جملہ لوازمات کے ساتھ تختہ دار پر کھڑا تو کر دیا جاتا ہے مگر تختہ نہیں کھولا جاتا۔

ہم نے بہت افسردہ ہو کر کہا کہ ایسے منگیتر تو واقعی مظلوم و مجبور لگتے ہیں۔ آخر کون سی مجبوری ان سے یہ کام کرواتی ہے۔ کہنے لگیں غربت۔ ماں باپ کی، بہن بھائیوں کی، بیوی بچوں کی۔ ہم نے تقریباً چیختے ہوئے کہا منگیتر اور بیوی بچے؟ کہنے لگیں آپ کیا جانیں۔ چھوٹی سی کی آڑ میں بڑے بڑے ڈرامے ہوتے ہیں۔

یہ مکار قسم کے منگیتر پکا ویزہ ملنے تک تو بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ اس قدر فرمانبردار کہ چاہے صبح ناشتے کی جگہ دس جوتے مارو مگر اف نہ کریں گے۔ اور جیسے ہی پکا ٹھپہ لگا، تو یہ اپنے پلان کے مطابق ہاتھ ہلاتے ہوئے کسی بہتر اسامی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو فیلڈ ورک پہلے ہی کر رکھا ہوتا ہے اور سیدھے کسی اپنے جیسی بے ضمیر خاتون کی چوکھٹ پر لینڈ کریں گے۔ ہم نے بے چین ہو کر پوچھا اور پہلی بیوی اور بچے۔ بھئی ان کو خرچہ برابر ملتا رہتا ہے۔ وہ تو ویزے کی مہر کی طرح پکے ہوتے ہیں۔

اب چھوٹی ی کی خوبیاں ہم پہ رفتہ رفتہ آشکارا ہوتی جا رہی تھیں۔ ہم نے مردہ سی آواز میں کہا مگر سب منگیتر تو ڈبل اسٹیٹس والے نہیں ہوتے۔ کچھ سنگل بھی تو ہوتے ہوں گے۔ بولیں ہاں ہوتے ہیں، ضرور ہوتے ہیں۔ مگر ان کے ماں باپ اور بہن بھائی ان کی مجبوری ہوتے ہیں۔ ان کی مجبوریوں کی داستان اتنی طویل ہوتی ہے کہ ان کی نئی نویلی مجبوری قطار میں سب سے آخر میں کھڑی کر دی جاتی ہے۔ برطانوی منگیتری کو مجبوری بنتے دیکھ کر انسانی ہمدردی کا زبردست حملہ ہمارے گداز دل پر ہوا کہ ایسی منگیتری تو مفت میں ہی ماری گئی۔ آخر بندہ شادی کرتا ہے تو کوئی جذباتی، معاشی اور سماجی تحفظ تو ملنا چاہیے۔ ہوم سویٹ ہوم کا خواب کون سی منگیتری نہیں دیکھتی۔ مگر یہاں تو شادی کے بعد بھی اللہ مارے ماں باپ کے گھر پڑے ہیں۔ یا کسی بیڈ سیٹ میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ کیونکہ نہ تو میاں کو کام ملنا ہے اور نہ ملنے کی امید۔ سارا سرکاری وظیفہ بینک ڈرافٹ کی نذر۔ ایسے میں دلہن ڈپریشن کا شکار ہو کر یا تو روتی دھوتی رہے گی یا پھر ہتھے سے

اکھڑ کر الٹی سیدھی حرکتیں شروع کر دے گی۔ اور میاں صاحب زیادہ ہی جل تو جلال تو ٹائپ ہوئے تو بغیر سوچ سمجھے اس کی دھلائی کر دیں گے۔ اس دھلائی کو سکھانے کے لیے کبھی کبھی تو اہل خانہ و اہل محلہ' پولیس' ڈاکٹر' سوشل سروسز' وکیل' مجسٹریٹ' ری فیوج ہوم سب مل کر دھاوا بول دیتے ہیں جو منگیتر کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔

اس کے برعکس کچھ منگیتر ولایت آنے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ وہ شوکن میلے دی بن کر شوقینی میں مارے جاتے ہیں۔ یہاں جب نہ دودھ اور شہر کی نہریں' نہ شیشے کی سڑکیں اور نہ ہی درختوں پر پاؤنڈ نظر آتے ہیں تو اپنے خوابوں کے ٹوٹ جانے کی شرمندگی سے بچنے کے لیے وہ ولایت میں ہی بھلی بری جیسی بھی گزرے "گزار لیتے ہیں مگر ولایت کا خوفناک نقشہ اپنی وصیت میں ضرور رقم کر دیتے ہیں۔ کہ پھر کوئی دام فریب میں نہ آئے۔

کچھ دیر رک کر کہنے لگیں کہ منگیتروں کی ایک خاص قسم بھی ہوتی ہے۔ انہیں ہوائی منگیتر کہا جاتا ہے۔ ہم نے بے یقینی سے انہیں دیکھا تو ہنس پڑیں۔ ہاں بھئی یہ منگیتر جب آتے ہیں تو ہوا میں تلواریں مارتے ہوئے آتے ہیں۔ دراصل یہ وہ نوجوان ہوتے ہیں جو اپنے ملک میں قدرے بہتر حالات دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ولایت انہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ یہاں کے لوگ انہیں جاہل' ان پڑھ لگتے ہیں۔ ان کی ہوابازی کے کرتب دیکھ کر برسوں سے ان کی منتظر منگیتری پھٹی پھٹی آنکھوں سے صرف انہیں دیکھتی رہ جاتی ہے۔ اس ساری کارروائی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ منگیتری یہ نہ سمجھ لے کہ ولایت بلوا کر

اس پر کوئی احسان کیا ہے۔ الٹا یہ چاہتے ہیں کہ منگیتری ان کی احسان مند ہو کہ لڑکے نے ہاں کردی۔ ایسے منگیتروں کی خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں بڑے پیچیدہ حالات کو جنم دیتی ہیں۔ ایسے منگیتر جلد ہی سب رشتوں ناطوں کو سلام کر کے ٹکٹ کٹا کریا تو واپس اپنے ملک یا کسی اور ملک کو سدھار جاتے ہیں۔

ہماری دوست کے خیال میں ولایت کو اس قدر حقیر جاننے والے منگیتروں کو یو۔این۔او میں پاکستان کی نمائندگی کرنی چاہیے۔ جو احساس برتری ان میں نظر آتا ہے' اس کی ایسی جگہوں پر زیادہ اور گھر کی چاردیواری میں کم ضرورت ہوتی ہے۔

ہم نے عاجز آکر کہا کہ بس یا کوئی اور دلیل ابھی باقی ہے۔ قہقہہ مار کر بولیں ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ منگنی' شادی' غریبی' مجبوری' مکاری' اور مغروری کی ی کا تعلق پانی شانی اور روٹی شوٹی کی ی سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ ہم نے پوچھا کہ پانی اور روٹی تک تو بات درست ہے مگر یہ شانی اور شوٹی کیا ان کے سوتیلے بہن بھائی ہیں۔ نہیں بھئی مہمل الفاظ ہیں۔ کچھ خاص مطلب تو نہیں ان کا بس ذرا زیب داستاں کے لیے لگالیے جاتے ہیں۔ لیکن جب پانی اور روٹی کے ساتھ لگ جائیں تو بندے کی مجبوری بن جاتے ہیں۔ بھئی ان سب کے آخر میں چھوٹی ی جو آتی ہے۔ ہمیں ایک دم یاد آگیا کہ بات ابھی تک چھوٹی ی پر اٹکی ہوئی ہے۔ اب تو ہماری دوست اپنی علمیت کا سیدھا سادا رعب جھاڑنے لگی تھیں۔ کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند کر کہنے لگیں بھئی جن رشتوں کے آخر میں ی آتی ہے' وہ بھی سنبھل کر برتنے والے ہوتے ہیں۔ مثلاً بیوی' بھابی' پھوپھی' چچی' تائی'

ممانی، نانی، دادی اور بیٹی۔ ہم نے کہا یہ بیٹی ان سب رشتوں کے بیچ کہاں آ پھنسی۔ تو ایک سرد آہ بھر کر کہنے لگیں کہ سب سے بڑا سکھ اور سب سے بڑا دکھ بیٹی ہی تو ہوتی ہے۔ پیدا ہوئی تو ماں باپ کم اور رشتے دار زیادہ پریشان۔ جوان ہوئی تو سب ہی پریشان۔ پیا گھر جا کر سکھی رہی تو اطمینان اور اگر دکھی ہو گئی تو سب ہی ہلکان۔

ہاں البتہ ماں، بہن، ساس اور نند کے رشتوں میں یہ چکر نہیں ہے۔ شاید اس لیے یہ رشتے سب سے زیادہ چکر دیتے ہیں۔ کیونکہ ماں تو ساس بن سکتی ہے مگر ساس ماں نہیں بن سکتی۔ اسی طرح بہن نند تو ہو سکتی ہے مگر نند بہن نہیں ہو سکتی۔ اس لیے مرد زندگی بھر بیوی اور بیٹی کے چکر میں کم اور ان رشتوں کے چکر میں زیادہ رہتا ہے۔

ہم نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے پوچھا کہ ماسی میں بھی توی والا چکر ہے تو پریشان ہو کر بولیں بہتر ہے کہ ماسی کو خالہ کہا جائے۔ کیونکہ ماں کی آدھی خوشبو اس نام میں آجاتی ہے لیکن اگر خالہ ماسی بن جائے تو پھر وہ ماسی ہی بن جاتی ہے اور گھر میں برتن کپڑے کرنے والی ماسی کی طرح عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ اور یہ حرکتیں اس وقت عروج پر پہنچ جاتی ہیں جب ماسی ساس بن جاتی ہے۔

ہم نے کہا پڑوسی کی ی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ بھئی پڑوسی کی ی تنگ و تاریک محلوں اور گلیوں میں زیادہ پریشان کن ہوتی ہے۔ جبکہ ماڈرن بستیوں میں جہاں بڑے بڑے بنگلوں میں شام و سحر ہو کا عالم رہتا ہے، وہاں یہ اپنی شرانگیزیوں سے محروم رہ جاتی ہے۔

ہماری دوست کی گوہر افشانیوں سے ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ ہم نے انہیں اپنی دانست میں گویا پھنسانے کے لیے ایک سوال کر ڈالا کہ ادبی محاذ پر تو یہ بہت اچھل کود کرتی ہوں گی۔ ان کے چہرے پر پہلی بار سایہ سا لہرا گیا اور سرد آہ بھر کر بولیں ادبی میدان میں اس کی تباہ کاریوں سے کون واقف نہیں ہے۔ اس کی گروہ بندی، تنگ نظری اور تعصب کے ڈانڈے کہاں کہاں جا کر ملتے ہیں، اگر ہم نے لب کشائی کی تو بے ادبی کے زمرے میں شمار ہوگی۔ اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ اس موضوع پر بات نہ کی جائے۔

بس اتنا جان لیں کہ اجارہ داری ایک لفظ ہے جو کہ معاشیات اور معیشت میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے، اگر ماہرین معاشیات کو ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ یہ اصطلاح مافیا والے ہائی جیک کر لیں گے تو وہ ضرور متبادل لفظ تلاش کرتے۔ آپ مشاعروں کو ہی دیکھ لیں۔ کیا کیا دھما چوکڑی ہوتی ہے۔ ہم نے کہا کہ مشاعرے کے آخر میں تو وہ آتی ہے پھر بھی..... سر ہلا کر کہنے لگیں بھئی حروف تہجی کے آخر میں آنے والے تینوں حروف ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کی خصوصیات میں کچھ خاص فرق نہیں ہوتا۔

ہم نے کہا لگے ہاتھوں اب سیاست میں بھی چھوٹی سی کوئی مثال دے دیں۔ کہنے لگیں ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ مثلاً اندرا گاندھی، واجپائی، ایڈوانی، کلنٹن کی ہلیری اور ریونسکی۔ ان کے ساتھ بی بی سی کو بھی شامل کر لیں۔ ہم نے کہا یہ بی بی سی کہاں سے آ گئی سیاست میں۔ کہنے لگیں بی بی سی سے بڑا سیاست دان کون ہے؟ ہم ان کی دور اندیشی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

ہم نے آخری سوال داغتے ہوئے کہا کہ آپ کی ساری مثالیں بیرون ملک سے تھیں۔ اپنے ملک میں چھوٹی ی کی قلت ہے کیا؟ نہیں قلت تو نہیں۔ اب ایک ایٹمی ی دریافت ہوئی ہے۔ جس نے سب حساب برابر کر دیئے ہیں۔ اب کسی کو ہمارے خطرناک ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کہہ کر انہوں نے محفل برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ہم نے انہیں روکا بھی نہیں کہ کہیں یہ محترمہ بھی ایٹمی خطرہ نہ بن چکی ہوں۔

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

(پروین شاکر)

ہائے یہ گوریاں

کسی زمانے میں گوریوں کا بڑا رعب ہوا کرتا تھا۔ پچاس کی دہائی میں برطانیہ آنے والے ایشیائیوں نے ان کی چمکتی دمکتی رنگت اور نازوادا سے متاثر ہو کر یا تو ان سے شادیاں کر لیں یا پھر ویسے ہی---

برطانیہ میں ایک ربع صدی گزارنے کے باوجود آج تک یہ عقدہ نہ کھل سکا کہ گوری کو آخر گوری کیوں کہتے ہیں؟ ہم نے تو لال گلابی رنگوں پر مشتمل گوریاں ہی دیکھی ہیں' ہاں البتہ غصے میں گوری نیلی اور غم میں پیلی ضرور ہوتی دیکھی ہے' لیکن رنگت اصلی ہونے کی وجہ سے گوری دھوپ میں بھی کبھی کالی نہیں ہوتی بلکہ سن ٹین ہو جاتی ہے۔ بادامی بادامی سی رنگت جسے ہمارے ملکوں میں خوبصورتی میں شمار نہیں کیا جاتا۔

دراصل گوری جب لٹھے کی چادر کی طرح سفید بلکہ نئی نکور ہو جاتی ہے تو پھر وہ چلتی پھرتی نظر نہیں آتی بلکہ گورستان میں آرام کرتی ہے۔ لیکن دائمی

آرام کرنے سے پہلے یہ ہمارے کتنے بھائی بندوں کو بے آرام اور کتنی نسلوں کو آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا جاتی ہے۔ یہ حساب پھر کبھی سہی۔

ہاں گوری اگر اپنے ہم نسلوں کے ساتھ یہ سلوک کرے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ ان کی زندگی میں پہلے ہی کون سا سکون ہوتا ہے۔ سکون کی تلاش میں بیچارے مادر پدر آزاد پھرتے رہتے ہیں۔

ہمارے ایشیائی بھائی بندوں سے شادی کرنے والی گوریاں کبھی کبھار شلوار قمیض سے بھی شغل فرماتی ہیں اور بعض تو فرفر پنجابی بھی بولتی ہیں۔ اس قسم کی گوری اور ڈنگوری میں ہمیں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا کیونکہ یہ ڈنگوری دن رات ہمارے ہم وطنوں کے سر پر پڑتی ہے جبکہ اپنے وطن کی عورت کو یہ بھائی بند کبھی اصلی اور کبھی باتوں کی ڈنگوریاں مار مار کر ادھ موا کر دیتے ہیں۔

جن گوریوں نے ہمارے ہم وطنوں کے ساتھ ساجھے داری کر رکھی ہوئی ہے، وہ ہماری زبان، تہذیب، ثقافت، سیاست اور مذہب غرضیکہ سب اندرون خانہ رازوں سے پوری طرح واقف ہو جاتی ہیں۔ ان کی نظر ہماری اچھائیوں پر کم اور برائیوں پر زیادہ رہتی ہے۔ جب جی میں آئے، نہ وقت نہ جگہ کا لحاظ، زہر اگلنا شروع کر دیتی ہیں۔ ان کی اس ایفی شینسی کو دیکھ کر کبھی کبھی تو کوبرا بھی شرما جاتا ہے۔ اس میں سارا قصور گوری کا نہیں کچھ فرق ہمارے نصیب کا بھی ہے۔ جسے دیکھو ہمارے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے لیکن اس سے ہماری صحت پر کیا فرق پڑتا ہے، ہم تو شاک پروف لوگ ہیں۔ اپنا دفاع کرنے کی بجائے دوسروں کے ساتھ مل کر اپنے وطن اور ہم وطنوں کی مزید برائیاں کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ اسی قسم کی گوری سے ہماری اٹامک وار ہوتے ہوتے رہ گئی۔ یہ محترمہ کئی مرتبہ پاکستان جا چکی تھیں۔ گویا ہمارے ماضی' حال اور مستقبل پر امریکہ کی طرح ان کی گہری نظر تھی۔ اٹھتے بیٹھتے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر ہماری برائیاں کیا کرتیں۔ آخر صبر کی بھی حد ہوتی ہے' مگر گوری کی شعلہ بیانی کی تو حد ہی نہ تھی۔ ہم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دن تو ہم نے گوری کا گھیراؤ کر کے اس کے خوب لتے لیے۔ گوری کو اپنی اعلیٰ نسل پر بڑا مان تھا۔ ہم نے بھی غصے میں کہہ دیا۔ اگر تم اتنی ہی اصیل ہو تو اپنی نسل کے کھونٹے سے کیوں نہ بندھیں' ہمارے گھروں میں جھک مارنے کیوں آگئیں؟ وہ دن اور آج کا دن اس سرحدی جھڑپ کے بعد تمام سفارتی تعلقات منقطع ہو چکے ہیں۔

شکر ہے کہ اس واقع کی اطلاع گوری نے ریس ریلیشن والوں کو نہیں دی وگرنہ ہم پر نسلی تعلقات خراب کرنے کا الزام آجاتا' اپنے ہم وطنوں سے ہم جیسے بھی بات کریں' مگر چٹی چمڑی والوں کو ترکی بہ ترکی جواب دینا کم از کم ہمیں تو زیب نہیں دیتا۔ آخر وہ کبھی ہمارے حاکم رہ چکے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو گئے وقتوں کا ہی لحاظ کر لیں۔ ہم بھی عجیب ہیں' بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑائی' ایک آزاد ملک حاصل کیا اور ان کی جدائی سے بدحال ہو کر پھر خوشی خوشی ان کی رعیت میں آ گئے۔ شاید بہت دیر تک اسیر رہنے والوں کو آزادی اچھی نہیں لگتی۔

آزادی پر یاد آیا کہ ہماری ایک دوست نے کافی عرصے سے ایک آسٹریلین طوطا پال رکھا تھا۔ ایک دن نہ جانے دل میں کیا آئی کہ پنجرے کا دروازہ کھول دیا'

دیکھتے ہی دیکھتے طوطا اڑن چھو ہو گیا' بہت پریشان ہوئیں کہ ظالم کتنا بے وفا نکلا۔ مڑ
کر بھی نہیں دیکھا۔ کون سا سکھ تھا جو اسے نہیں دیا۔ ایسی طوطا چشمی۔ اسی ادھیڑ
بن میں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی' مگر یہ دیکھ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ طوطا گھوم
پھر کر واپس پنجرے کے پاس آ کر بیٹھا ہوا تھا۔

اس واقعے سے ہمیں تو ایسا ہی لگا جیسے ہم بھی قفس کے عادی ہو چکے ہیں۔
ولایتی پنجرہ اب ہمارا مقدر بن چکا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے رہا ہو کر وطن میں
آتے تو ہیں مگر پھر اسی پنجرے میں قید ہونے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔

گوری میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو' یہ گڈ ٹائمز کی ساتھی ضرور ہوتی ہے۔
دکھ سے کوسوں دور بھاگتی ہے' اور صرف سکھ میں ساتھ رہنے کی سچی قسم کھاتی
ہے۔ ادھر آپ کے حالات بگڑے' صحت خراب ہوئی اور ادھر گوری صاحبہ رفو
چکر۔ آخر مغربی اور مشرقی عورت میں کوئی تو فرق ہونا چاہئے' ورنہ برطانیہ میں
ہر گھر میں گوری ہی نظر آئے گی۔ مشرقی بیوی کو چاہے میاں نے ساری زندگی
محبت کی ایک نظر سے نہ دیکھا ہو مگر برے وقتوں میں یہ سب کچھ بھول بھال کر
غمگساری کرنے کو تیار۔ ہماری عورتیں شوہر پرستی میں اتنا آگے نکل جاتی ہیں کہ
کبھی کبھی تو ان پر بت پرست ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

کچھ لوگ تو گوری کے شکنجے میں زندگی سے ہی آزاد ہو جاتے ہیں یا یوں کہئے
کہ گوری انہیں ترس کھا کر چھوڑ دیتی ہے' مگر کچھ لوگ اس کے سحر سے زندگی بھر
آزاد نہیں ہو پاتے۔ گوری کی نرم و نازک بانہوں میں دم توڑنے کے بعد ہی
عزیزوں کو اطلاع ملتی ہے اور اکثر صورتوں میں تو یہ جانکاہ خبر اس وقت ملتی ہے

جب منکر نکیران کی قسمت کا فیصلہ کر چکے ہوتے ہیں۔

گوری کی ٹھنڈی ٹھار چھاؤں میں مرحوم جن عزیزوں کے نام تک بھول چکے تھے وہی روتے روتے نہیں تھکتے کہ جنازے کو کندھا نہ دے سکے۔ پتہ نہیں گوری نے آخری وقت میں کیا درگت بنائی ہوگی؟ ان سے کوئی پوچھے کہ اب گوری نے کیا درگت بنانی تھی۔ جو ہونا تھا وہ تو زندگی میں ہی ہو چکا۔ مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے قرآن پاک پڑھائے جاتے ہیں۔ گویا انہیں ایک بار پھر مسلمان کیا جا رہا ہو۔ لواحقین کو اپنے گناہوں کی اتنی فکر نہیں ہوتی، جتنی مرنے والے کی عاقبت کی۔

کئی مرتبہ تو صورت حال دلچسپ نہیں بلکہ عبرتناک ہو جاتی ہے۔ گوری کا اصرار ہوتا ہے کہ میت جلائی جائے گی اور اگر کفن دفن پر رضامند ہو جائے تو پھر مطالبہ ہوتا ہے کہ مرحوم کو سوٹ بوٹ میں بڑھیا پرفیوم لگا کر آگے بھیجا جائے۔ جہاں تو گوری ذرا کمزور قسم کی ہوتی ہے وہاں تو میت صحیح سالم گوری کے پنجے سے برآمد کر لی جاتی ہے، البتہ دبنگ قسم کی گوریاں سوٹ بوٹ میں ہی مرحوم کو اگلی دنیا میں پارسل کر دیتی ہیں۔

برطانیہ میں پرورش پانے والے جوان بیٹوں کی مائیں بھی بڑی وہمی ہوتی ہیں۔ گوریوں سے بہت خوفزدہ رہتی ہیں۔ انہیں الٹے پاؤں والی چڑیلیں کہتی ہیں کہ جہاں گوری نے صدا لگائی، صاحبزادے نے مڑ کر دیکھا اور سمجھو پتھر کے ہو گئے۔ کچھ ماں باپ تو عمر بھر اس پتھر سے سر پھوڑتے اگلی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

اپنے اپنے نصیب کی بات ہے کہ کچھ دیسی بیویوں کے آنگن کی خوشبو

گوری کے گلشن حیات کو معطر کرتی رہتی ہے جبکہ ان کے حصے میں دھول مٹی ہی آتی ہے۔ رشک آتا ہے گوریوں کے نصیب پر کہ کیسے شوہر کو کمان میں تیر کی طرح کس کر رکھتی ہیں۔ کیا مجال ذرا جھول آجائے۔ ہمارے ہم وطن گوریوں کے ہاتھوں تو کمان میں کس جائیں گے، مگر اپنی مشرقی بیویوں کو خود کمان میں کس کر رکھیں گے۔

اس قدر خوش نصیبی کے باوجود گوریوں کو بھی زندگی میں کچھ صدمے اٹھانے پڑ جاتے ہیں۔ گوریوں کے لیے آج کل سب سے بڑا صدمہ یہ ہے کہ دیسی میموں کی وجہ سے ان کی مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہو رہی ہے۔ یہ دیسی میمیں گوریوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ اسی پریشانی میں گوریاں عجیب و غریب حرکات کرتی ہیں مثلاً کبھی ساڑھی تو کبھی شلوار قمیض زیب تن کرتی ہیں۔ ہاتھوں پر بندیا تو ماتھے پر مہندی لگاتی ہیں۔ جسم پر پیاز کا پرفیوم اور گھر میں لہسن کا ایر فریشنر مارتی ہیں، پھر بھی کسی دیسی کی نظر نہ پڑے تو باقاعدگی سے بالٹی ریسٹورنٹ جاتی ہیں کہ شاید کوئی دل پھینک قسم کا کھاتا پیتا دیسی انہیں گود لے لے۔

ریسٹورنٹ سے یاد آیا کہ ہمارے دیسی بھائی گوری کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں، کیونکہ گوری نے نہ تو کھانے میں نقص نکالنا ہوتا ہے، چاہے اسے مرچوں کا قورمہ، مرچوں کے کباب دے دو، وہ بہت سعادت مندی سے کھا جائے گی اور نہ ہی اس نے ٹپ دینے میں کنجوسی کرنی ہوتی ہے۔ مرچوں سے گوری کا دماغ اس طرح چکرا جاتا ہے کہ اسے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا کر رہی ہے۔

اس کے برعکس ہمارے جیسے گاہکوں کو تو دیکھ کر ریسٹورنٹ والوں کی تیوری

پر بل پڑ جاتے ہیں' چہرے لٹک جاتے ہیں' مرے مرے قدموں سے آرڈر لینے کے لیے آتے ہیں۔ جیسے دل میں کہہ رہے ہوں' یہ مصیبت کہاں سے نازل ہو گئی۔ کاہل عورت' گھر میں کھانا نہیں پکا سکتی۔ یہاں کیا خاک ملے گا کھانے کو۔ یہ تو خاص گوریوں کے لیے اہتمام کیا گیا ہے۔ ریسٹورنٹ والوں کی پریشانی دیکھ کر ہم نے باہر کھانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کیوں کسی کا موڈ اور اپنا معدہ خراب کریں۔ گوری کی حکمرانی ہے' وہ خوش تو راوی چین ہی چین لکھے گا۔

گوری میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ وہ صرف شادی کرنے کے لیے اسلامی نام رکھتی ہے۔ دل سے اسلام قبول نہیں کرتی۔ ویسے گوری سے شادی کرنے والے ہمارے بھائی بند خود بھی اسلام پر عمل پیرا نہیں ہوتے' مگر انہیں اتنا ضرور علم ہوتا ہے کہ اہل کتاب سے شادی کرنا مذہب اسلام میں جائز ہے۔ اب اس بات کی گواہی کون دے گا کہ گوری واقعی اہل کتاب ہے یا نہیں۔ بائبل پڑھنا اور اس پر عمل کرنا تو بڑی بات ہے چاہے اس نے بائبل کی شکل تک نہ دیکھی ہو۔

ویسے خاندانی گوری ابھی بھی کالے آدمی کے بارے میں تعصب کا شکار ہے' لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مالدار ایشیائیوں سے دوستی یا شادی کرنے میں کوئی خاص برائی نہیں سمجھتی۔ اس بات سے عام آدمی کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ہاں البتہ اگر ان کی لاٹری نکل آئے تو بات بن سکتی ہے۔ اس لیے ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ ہفتے میں دو بار نہیں تو ایک بار لاٹری ضرور بھریئے۔ شاید قسمت مہربان ہو جائے اور ساتھ ہی گوری بھی قدردان ہو جائے۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
(فیض احمد فیض)

ادبی جمود

سنا ہے کہ ہمارے دانشور جب کبھی بھی رسمی یا غیر رسمی طور پر مل بیٹھتے ہیں تو اردو ادب پر طاری جمود کے بارے میں بہت پریشان بلکہ پروفیسر پری شان بن جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں پروفیسر صاحب بھی زندگی میں اپنے اس منفرد نام سے اتنے پریشان نہ ہوئے ہوں گے بلکہ جس نے نام ہی پری شان رکھ لیا تو پریشانی کو ان سے کیا سروکار؟ ایسے میں پریشانی در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کے آنگن میں خیمے گاڑ دیتی ہے۔

دانشور قسم کے لوگوں کو کسی ایک نقطے پر متفق ہوتے ہوئے کم ہی دیکھا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر یہ انہونی ہو جائے تو وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ادب پر طاری جمود کو توڑنے کے لیے یہ تیشہ فرہاد ثابت ہو گا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اتنا پڑھ لکھ کر بھی بندے کو اگر کلہاڑا ہی بننا ہے تو پھر اس قدر عرق ریزی کا مطلب؟ ویسے جب تک آدمی کسی سے اختلاف نہ کر لے اس کے پڑھے لکھے

ہونے کا پتا نہیں چلتا۔ چپ چاپ دوسروں کی ہاں میں ہاں ملا دینے سے یہ کیسے پتا چلے گا کہ ہم عقل ودانش کی کس سیڑھی پر لڑھک رہے ہیں؟

بات بات میں اختلاف کرنے اور دوسروں کے کام میں کیڑے نکالنے کی عادت بری تو لگتی ہے' کیونکہ اختلاف برائے اختلاف یا تنقید برائے تنقید سے کوئی ذاتی فائدہ تو حاصل ہو سکتا ہے' مگر اصلاح کا پہلو نکلنے کا امکان کم ہی ہوتا ہے لیکن یہ کئے بغیر ہمارے تعلیم یافتہ اور اینٹی لیکچوئل ہونے کا پتہ بھی تو نہیں چلتا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ہمارے ہاں تعلیم کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ مغربی اقوام ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ جو بیچارے تنقید کرتے ہوئے بھی اصلاح کا پہلو مد نظر رکھتے ہیں۔

ہم جب بھی ادبی جمود کی بات کرتے ہیں تو ہمیں سوئٹزرلینڈ یاد آجاتا ہے۔ برف سے ڈھکے ہوئے بلکہ جمے ہوئے پہاڑ۔ پھر جب اس گلیشیئر کا سوچتے ہیں جو ہمارے ادب پر بے نیازی سے براجمان ہے تو ہم جلدی سے ایسے طریقے سوچنے لگ جاتے ہیں جن سے یہ برف پگھل سکتی ہو لیکن اس فریز شدہ دماغ میں کوئی سوچ بھی تو نہیں آتی۔

ہماری دوست کا کہنا ہے کہ اب شاعر اور ادیب بھی کیا کریں' آخر انسانی ذہن ہی تو ہے' کہاں تک ساتھ دے گا۔ مسلسل فصل دیتے دیتے تو زمینیں بھی تھک جاتی ہیں۔ برس ہا برس سے چلنے والے دریا رخ بدل لیتے ہیں۔ اب دماغ کو اگر کوئی نئی بات نہ سوجھے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔ بقول ہماری دوست اب ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو کوئی نئی دنیا تلاش کرنا پڑے گی۔ اس دنیا اور

اس میں رہنے والوں کا تو وہ ہر زاویہ دریافت کر چکے ہیں۔ اب نئی تشبیہات و استعارات آخر کہاں سے آئیں۔ ممکن ہے جب دوسرے سیارگان پر آبادکاری ہو تو نئی دنیائیں آشکار ہو کر نیا ادب لکھنے میں کچھ مددگار ثابت ہوں۔ جس سے شاید موجودہ ادبی جمود دم توڑ جائے۔

ہمیں ان کے خیالات سے قدرے اختلاف ہے کہ دوسری دنیائیں تو پتہ نہیں کب دریافت ہوں گی۔ کب ان پر آبادکاری ہوگی تو کیا اس وقت تک ہمارا ادب سرد خانے میں پڑا رہے گا۔ ویسے ایک راز کی بات بتاتے ہیں کہ ادب پر طاری جمود کو توڑنے کی سرتوڑ یعنی سرپھوڑ قسم کی کوششیں اردو کے تیسرے مرکز یعنی برطانیہ میں شروع ہو چکی ہیں۔ اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ کوششیں اردو کے پہلے نہیں تو دوسرے مرکز سے ہی شروع ہو جاتیں۔ خیر کیا فرق پڑتا ہے' کوشش تو کوشش ہی ہوتی ہے۔ مشرق سے ہو یا مغرب سے۔

اردو ادب پر طاری جمود کو توڑنے کے لیے برطانیہ کے ایشیائی ریڈیو اسٹیشن بہت فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ شعروشاعری کے پروگراموں میں لوگ اساتذہ تک کے کلام کو اپنا کلام کہہ کر سنا جاتے ہیں۔ پروگرام کرنے والوں کو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس کا کلام تھا بلکہ شاید وہ اچھے بھلے شاعر کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتے تو کلام کا کیا خاک پتہ چلے گا۔ ایسے میں ہم جیسے کورذوق پری شان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس فاش چوری کی اگر نشاندہی کی جائے تو بڑی معصومیت سے جواب دیتے ہیں کہ اچھا' میرا خیال تھا کہ یہ میرا شعر ہے۔ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔

اس پر یاد آیا کہ ایک محترمہ کو لکھنے لکھانے کا بہت شوق ہے اور وہ بضد ہیں کہ اگر کرنی ہے تو شاعری ہی کرنی ہے، کسی اور صنف سخن کو وہ خاطر ہی میں نہیں لاتیں۔ ایک دن صبح ہی صبح ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف سے محترمہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ --- آج تو غضب ہو گیا۔ ایک شعر ہو گیا۔ ہم نے کہا سبحان اللہ، بسم اللہ کیجیے۔ اب شعر سنیے۔

وہ جو خوشبو بن کے بیٹھا تھا میرے سامنے
میں اسے محسوس کر سکتی تھی چھو سکتی نہ تھی

ہم نے تڑپ کر کہا۔ یہ تو عدیم ہاشمی کی معروف غزل کا شعر ہے۔ ایسے دن دہاڑے چوری کرتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔ روہانسی ہو کر کہنے لگیں واقعی ہم بھی کہیں کہ اتنا اچھا شعر ہم سے نہیں کہا جا سکتا۔ ہم نے کہا اچھا کیا' آپ نے تو اس کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ جائیے سو جائیے لمبی تان کر۔

شاعری کرنے کے شوقین کچھ لوگ تو مقطع میں سے اصل شاعر کا نام ہٹانا بھی گوارا نہیں کرتے۔ جیسے اس شاعر نے ان کا کلام چوری کر لیا ہو۔ اس پر بس نہیں ساتھ ہی اپنا نام بھی ٹھونس دیں گے۔ اب آپ ہی انصاف کریں کہ دو ناموں والا مقطع مرزا غالب' میر تقی میر' علامہ اقبال یا فیض احمد فیض لکھ پائے' ہرگز نہیں۔ تو یہ ادب پر طاری جمود کو توڑنے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے؟

ادبی جمود کو توڑنے کی دوسری کوشش کسی لطیفے سے کم نہیں۔ ہم نے برطانیہ کے ایک ریڈیو اسٹیشن کی انتظامیہ کو مفت مشورہ دیا کہ اردو ادب کے پروگراموں کو بہتر بنانے کے لیے اچھے اچھے شاعروں اور ادیبوں کو دعوت دیں۔

معیاری کلام اور گفتگو سننے کو ملے گی۔ عوام الناس کا ذوق بلند ہو گا۔ بے وزن اشعار اور غلط سلط تلفظ سن کر تو کان سراپا احتجاج بن گئے ہیں۔ ہماری بات سن کر بہت سنجیدگی سے کہنے لگے کہ ریڈیو پر آنے کے لیے شاعروں اور ادیبوں کو پیسے دینے پڑیں گے۔ ان کا جواب سن کر ہم ان کی ادب نوازی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ واہ' کیا بات ہے۔ شاعر' ادیب اور پیسے۔ کتنی متضاد بات ہے۔ یہ لوگ تو الفاظ و خیالات کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ ویسے ابھی اردو ادب پر اتنا بھی جمود طاری نہیں ہوا کہ یہ لوگ پیسے دے کر اپنا وقت اور پیٹرول برباد کر کے آپ کے پروگراموں کو رونق بخشیں۔ پیسے تو الٹا آپ کو انہیں دینے چاہئیں۔ ہماری اس تجویز پر ریڈیو انتظامیہ ہمیں یوں گھور گھور کر دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کیا غیر کاروباری ذہنیت پائی ہے۔

ہمارے خیال میں ذرائع ابلاغ کی ترقی نے بھی ادب پر طاری جمود کو توڑنے میں کافی مدد کی ہے۔ اب شاعری امپورٹ کرنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ کہاں ایک غزل مہینوں میں سفر کی صعوبتیں اٹھاتی ہوئی پہنچتی تھی۔ اب تو فیکس' ای میل' ٹیلی فون نے ساری مشکل ہی آسان کر دی ہے۔ ہمارے دوست کا خیال ہے کہ مشکل آسان نہیں ہوئی بلکہ بڑھ گئی ہے۔ اب ایسے ایسے لوگ شاعر کہلانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں جو دوسروں کی لکھی ہوئی غزل بھی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکتے۔

ہم نے کہا' آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ انہیں جلدی میں ریہرسل کرنے کا موقع نہیں ملا ہو گا۔ شاعروں کی زبوں حالی پر ہمیں وہ سیٹھ صاحب یاد آ رہے ہیں

جو کسی محفل میں ایک شاعر سے پوچھنے لگے 'حضرت آپ کام کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے خوش ہو کر جواب دیا' شاعر ہیں' شاعری کرتے ہیں۔ سیٹھ صاحب نے پھر پوچھا۔ کوئی کام دھندا تو کرتے ہوں گے۔ تو شاعر صاحب سینہ پھیلا کر بولے 'نہیں جی شاعری کرتے ہیں۔ گویا سیٹھ صاحب کے نزدیک شاعری کرنا کوئی کام نہ تھا۔

ادب پر طاری جمود کو توڑنے کا ایک تیر بہدف نسخہ ہمارے فریز شدہ ذہن میں بھی آ رہا ہے کہ اساتذہ کے نام ذرا تبدیلی کر دیئے جائیں۔ مرزا غالب تو پہلے ہی مرجا گالب بن چکے ہیں۔ میر تقی میر کو نیر تقی نیر کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ محبوب کے غم میں بہت آزردہ خاطر رہتے تھے اور ہر وقت آنسو بہاتے رہتے تھے۔ اسی طرح داغ کو بے داغ کہہ سکتے ہیں' بہادر شاہ ظفر کو مجبور یا محصور شاہ ظفر کہہ سکتے ہیں۔ اب باقی کا کام آپ کریں۔

ہماری دوست کے خیال میں ادب پر جمود اس لیے بھی طاری ہو گیا ہے کہ مشاعروں میں سامعین سے زیادہ مہمان خصوصی ہوتے ہیں۔ اگر اتنی کثیر تعداد میں مہمان خصوصی بنائے جا سکتے ہیں تو پھر حاضرین خصوصی کیوں نہیں ہو سکتے؟ اگر حاضرین نہ ہوں گے تو مشاعرے کون سنے گا؟ نظامت کرنے والوں کو میزبان خصوصی کا عہدہ ملنا چاہئے۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر نہ شاعروں میں کوئی صدر رہو نہ مہمان خصوصی۔ اسٹیج پر ایک تپائی رکھ کر اس پر ایک کتاب (موٹی سی) جو حاضرین کو نظر آسکے' ایک لالٹین اور گلاب کے چند مرجھائے ہوئے پھول رکھ دیئے جائیں کیونکہ شاعروں کا کل اثاثہ 'کتاب' چراغ اور خوشبو ہی ہوتا ہے۔ ایسے میں نظامت بھی پردے کے پیچھے رہ کر ادا کی جائے۔ یعنی مکمل طور پر بات

اشاروں کنایوں میں ہو تو پھر جمود ٹوٹنے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ ہم نے کہا کہ ایسے میں مشاعرہ پڑھنے کون آئے گا؟ تو ہنس کر بولیں۔ کیا فرق پڑ جائے گا؟

ہماری دوست کا ذہن بہت زرخیز ہے۔ پتہ نہیں یہ جمود کی زد میں کیوں نہیں آتا؟ اصل میں یہ نہ تو شاعر ہیں' نہ ادیب بلکہ تنقید کرتی ہیں' لکھتی نہیں۔ کہتی ہیں کہ جمود کو توڑنے کی ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اساتذہ کے کلام میں نئے معانی تلاش کئے جائیں مثلاً غالب کا یہ شعر لے لیں۔

قرض کی پیتے تھے مے' لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا نے غربت کے باوجود جو شوق پال رکھے تھے ان کی تکمیل ادھار کے سوا اور کیسے ہو سکتی تھی؟ مرزا بھی بڑے کائیاں تھے۔ جانتے تھے کہ ادھار محبت کی قینچی ہے۔ اگر ادھار نہیں لیں گے تو قرض کی وصول یابی کے لیے کون پریشان کرے گا؟ پریشان نہ ہوں گے تو اچھی شاعری نہ کر سکیں گے۔ کوئی کام دھندا کر کے روزی کمانے کا وسیلہ کر سکتے تھے مگر انہیں معلوم تھا کہ بھرے پیٹ سے تو ذوق جیسی شاعری ہی ہو گی۔ دیوان غالب تو نہ لکھا جا سکے گا۔ اسی طرح شاعر مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر لے لیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

دراصل اس شعر میں علامہ اقبال لوگوں کو پہاڑی مقامات پر جا کر چھٹیاں گزارنے کا مشورہ دے رہے ہیں' کیونکہ ان کا تعلق بھی کشمیر سے تھا۔ ہمارے

ملک میں تو بادشاہت نہیں ہے اس لیے لوگوں نے اپنے گھروں کے باہر ہی قصر فلاں فلاں لکھ کر لگا رکھا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں چھٹیوں میں زیادہ تر عزیز و اقارب کے ہاں جانے کا رواج ہے اس لیے حکیم الامت منع کر رہے ہیں کہ اپنی چھٹیوں کے لیے دوسروں کی زندگیاں اجیرن نہ کرو۔ اس کے بجائے صحت افزا پہاڑی مقامات پر جا کر قدرت کی صناعی کے نظارے کرو۔ اس صورت میں پاکستان کے لوگ تو شمالی علاقہ جات میں جا سکتے ہیں جبکہ برطانیہ کے لوگوں کے لیے اسکاٹ لینڈ بہترین جگہ ہے۔ لندن جا کر چھٹیاں منانے سے منع کر رہے ہیں کیونکہ وہاں ایک تو ٹریفک کا رش بہت ہے۔ مہنگائی کمر توڑ دیتی ہے اور قصر شاہی یعنی بکنگھم پیلس بھی وہاں ہے جس سے دور ہی رہنا چاہیے۔

ہماری اس زرخیز ذہن والی دوست کے خیال میں ادبی جمود کو توڑنے کے لیے فی الحال اتنی تجاویز کافی ہیں۔ اگلے عشرے میں اگر ان پر دیانتداری سے عمل ہو گیا تو پھر صورت حال کا جائزہ لے کر مزید مشورے دیئے جا سکتے ہیں۔

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں
(احمد فراز)

ایجنڈا

ایجنڈا ویسے تو انگریزی زبان کا لفظ ہے، مگر یہ ہماری زندگیوں پر کچھ اس طرح سے قابض ہو چکا ہے کہ ہم اردو میں بھی اس کا استعمال نہایت وسیع القلبی سے کرتے ہیں۔ ایجنڈے کی برکات سے ہماری بے آب و گیاہ زندگیاں کافی حد تک رنگین ہو چکی ہیں۔ اگر ایجنڈے کو ہم اپنی زندگیوں میں سے منہا کر دیں تو معاملہ کچھ یوں ہو جائے گا جیسے ہوا نکلا ہوا غبارہ یا روح کے بغیر جسم۔ غبارے اور بندے میں سے ہوا نکل جائے تو دونوں ہی زمین کا رزق ہو جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ جو بزم رونق ہے وہ ایجنڈے کے دم سے ہی ہے۔ ایجنڈے کی اس اہمیت کے پیش نظر ہماری ایک دوست اسے جھنڈا کہتی ہیں۔ جب ہم نے ایجنڈے اور جھنڈے کی نسبت کے بارے میں استفسار کیا تو بہت معصومیت سے کہنے لگیں۔ بھئی آج کل ہر کوئی اپنا اپنا ایجنڈا لیے پھرتا ہے۔ یہی کوشش ہوتی ہے کہ بس ان کا ہی جھنڈا لہرائے۔ ہم نے کہا کہ ایجنڈا کو جھنڈا کہنے پر ہمیں اعتراض ہے کیونکہ

جھنڈا کسی ملک و قوم کی شناخت ہوتا ہے، لوگ اس کے احترام میں سر جھکا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ہماری تشویش پر گویا ہوئیں کہ جو لوگ اپنے اپنے ایجنڈے لیے پھرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا وہ ان کا احترام نہیں کرتے۔ سر جھکانے پر کیا موقوف۔ وہ تو سر کے بل کھڑے ہوتے ہیں اس کے احترام میں اور ضرورت پڑے تو لیٹ بھی جاتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ تم نے کسی کو جھنڈے کے احترام میں سر کے بل کھڑے ہوتے یا لیٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر نہیں دیکھا تو خاموش ہو جاؤ۔ پھر بھی اگر تمہیں ایجنڈے کو جھنڈا کہنے پر اعتراض ہے تو اسے ترنگا کہہ لو لیکن اس سے سفارتی تعلقات متاثر ہو سکتے ہیں۔

ہماری دوست کا کہنا ہے کہ ایجنڈے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک شخصی اور دوسرا اجتماعی۔ لیکن شخصی ایجنڈا انبرون ہوتا ہے۔ ایجنڈے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اسے ہمیشہ سات پردوں میں لپیٹ کر رکھا جاتا ہے، کیونکہ اگر اسے ہوا لگ جائے تو پھر یہ ایجنڈا نہیں رہتا بلکہ انڈہ اور وہ بھی گندہ انڈا بن جاتا ہے۔ گندے انڈوں کی مار سے بچنے کے لیے اس کی عوامی رونمائی نہیں ہوتی۔ ہم نے کہا گویا ایجنڈا نہ ہوا نئی نویلی دلہن ہو گئی جسے غیر شادی شدہ حضرات سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔

چھپانے پر یاد آیا کہ ہم اس فن میں بہت ماہر ہیں۔ حکومتیں عوام سے حقائق چھپاتی ہیں۔ حکومتوں کے مشیر حکومتوں سے پردہ پوشی کرتے ہیں۔ سیاستدان ووٹ لینے کے بعد عوام سے چھپے پھرتے ہیں۔ صرف بیچارے عوام ہیں جو درد دل ظاہر کرتے ہیں مگر ان کی اشک شوئی نہیں ہوتی۔

عوام اور حکومتوں کی اس ہائیڈ اینڈ سیک یعنی لکن میٹی سے ہمیں اپنا بچپن یاد آجاتا ہے جب یہی کھیل کھیلنے پر ہماری سرزنش ہوتی تھی۔ معلوم نہیں اس قدر بے ضرر کھیل پر اتنی کڑی پابندیاں کیوں تھیں۔ ہمارے سیاست دان کب سے چور سپاہی کھیل رہے ہیں آخر انہیں مرغا کیوں نہیں بنایا جاتا۔ ککڑوں کڑوں کرنے کے لیے کیا معصوم بچے ہی رہ گئے ہیں۔

دراصل ہم اپنی تجسّس کی عادت کے ہاتھوں بہت تنگ ہیں۔ ہر شخص کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اگر ماحول میں شک کا زہر سرایت کرچکا ہو' پھر کوئی اس سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ویسے نیک نیتی اور خلوص کا فقدان ہو تو اسی قسم کے وبائی امراض زور پکڑ لیتے ہیں۔ اس پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی عادت نے ہمارے بہت سے خیر خواہوں کو ہم سے بدظن کر رکھا ہے۔ ویسے دوستوں کو ناراض کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے' مگر ناراضگی کبھی کبھی سودمند ثابت ہوتی ہے اور بہت سے غیر ضروری سوالات سے جان بچی رہتی ہے۔

ہماری دوست کا کہنا ہے کہ لڑائی جھگڑا اچھا نہیں ہوتا۔ ہم بھی کہتے ہیں بالکل غلط ہے' مگر ان لوگوں کا کیا کیا جائے جو ہر چوتھے دن لڑائی کی سبیل نکال کر پھر صلح کا جھنڈا لہراتے چلے آتے ہیں۔ اب ایسی صلح سے کیا فائدہ؟ اس سے تو اچھا ہے کہ مستقل لڑائی ہی رہے تاکہ کم از کم جھنڈے کی بے حرمتی تو نہ ہو۔

صلح پر یاد آیا کہ ہمارے مذہب میں روٹھے ہوؤں کے درمیان صلح کرانا بہت ثواب کا کام ہے۔ ہمارے ایک جاننے والے اس مذہبی بونس سے پورا پورا فائدہ

اٹھاتے ہیں۔ پہلے عزیزوں رشتہ داروں کو دانہ ڈالتے ہیں۔ جب وہ چگ کر بد ہضمی کا شکار ہوتے ہیں اور بول و براز کی نوبت آتی ہے تو پھر صلح کا جھنڈا لہراتے ہوئے میدان میں اترتے ہیں۔ دونوں پارٹیوں کی صلح کرواتے ہیں بلکہ اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے دعوت بھی کرتے ہیں اور صلح کا کریڈٹ سمیٹ کر کسی دوسرے محاذ پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی تجسّس اور شکوک و شبہات کی۔ ایک مرتبہ تو ہماری اس عادت نے ہمیں عجیب صورت حال سے دوچار کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک میٹنگ کا بلاوا آگیا۔ جس کے ساتھ ایجنڈا بھی منسلک تھا۔ کاغذات کو خوب الٹ پلٹ کر دیکھا کہ شاید کسی خانے میں خفیہ ایجنڈے کے بارے میں کوئی معلومات ہوں' کیونکہ اصلی ایجنڈا تو بہت بے ضرر سا لگ رہا تھا۔ ہماری سادگی دیکھیے کہ بھلا خفیہ ایجنڈا بھی کوئی کاغذ اور قلم کے سپرد کرتا ہے۔ یہ تحریر تو دلوں پر نقش ہوا کرتی ہے۔ شاید ایسی ہی تحریروں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "لکھے موسیٰ اور پڑھے خدا۔"

لکھنے لکھانے پر یاد آیا کہ ہمارے ڈاکٹر حضرات کی خوش نویسی مشہور ہے۔ ایسی ایسی تحریریں نسخہ جات پر دیکھنے کو ملتی ہیں کہ جیسے ڈاکٹر نے یہ نسخہ اپنے ہی لیے لکھا ہے۔ یہ تحریر اگر رائٹنگ ایکسپرٹس کو تجزیئے کے لیے بھیجی جائے تو وہ بھی معذرت کر لیں۔

خیر ہماری ہینڈ رائٹنگ بھی کسی ڈاکٹر یا کنسلٹنٹ سے کم نہیں ہے۔ اس کی تصدیق ہماری بیٹی کے اسکول کے انگریز ہیڈ ماسٹر کر چکے ہیں اور جس چیز کی تصدیق

انگریز کر دیں، وہ تو کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ ہیڈ ماسٹر کے نام لکھے ہوئے ایک خط کو پڑھ کر اس نے ہماری بیٹی سے بہت رازداری سے پوچھا "کیا آپ کی امی ڈاکٹر ہیں؟" بچی حیران پریشان کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ گھر آ کر ہم سے پوچھنے لگی تو ہم صرف مسکرا کر رہ گئے کہ پتہ نہیں کہاں سے پڑھ کر آ جاتے ہیں ہیڈ ماسٹری کرنے۔

بہرحال بات ہو رہی تھی میٹنگ کی۔ حسب عادت ہم شکوک و شبہات میں گھرے مذکورہ میٹنگ میں جا پہنچے۔ صدر میٹنگ کو ایک طرف بلا کر پوچھا کہ ابھی بتا دیں کہ اصل ایجنڈا کیا ہے۔ یعنی کس بات کی حمایت کرنی ہے اور کہاں مخالفت کرنی ہے۔ ہمارا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ جہاں لوگ حمایت کرتے ہیں، ہم اکثر مخالفت کا روڑا اٹکا دیتے ہیں اور جہاں مخالفت ہو رہی ہو، ہم وہاں حمایت کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ آخر انفرادیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جو سب کر رہے ہیں، بلا سوچے سمجھے وہی کرتے چلے جائیں۔ ویسے ہماری اس انفرادیت کی وجہ سے ہمیں میٹنگوں میں کم ہی بلایا جاتا ہے۔

صاحب صدر ہماری دوراندیشی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے، ستائشی نظروں سے ہمیں یوں دیکھنے لگے کہ ہم شرمندہ سے ہو گئے کہ شاید کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ شہد میں گھلے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔ بس جی جس بات کی مخالفت کرنا ہو گی ہم ناک پہ انگلی رکھ دیں گے۔ ہم نے پریشان ہو کر پوچھا کہ اپنی ناک پر یا ہماری ناک پر۔ ہماری بات سن کر کہنے لگے۔ بھئی آپ تو مذاق کر رہی ہیں۔ ہم نے کہا ایجنڈے کی قسم جو مذاق کیا ہو، ہم تو واقعی سنجیدہ ہیں۔ صرف صورت حال کی وضاحت درکار ہے۔ یوں سمجھئے کہ ڈرامے سے پہلے ڈریس ریہرسل کر رہے

ہیں۔ کہنے لگے بس جہاں ناک اور انگلی کے درمیان فاصلہ رہے وہاں حمایت ہی حمایت ہے۔ ہم نے کہا واہ خوب' تو یہ ایجنڈا بھی جھنڈا ہی ہے۔ کچھ خجل سے ہو کر کہنے لگے۔ بس کچھ ایسا ہی ہے۔

خیر ایجنڈے کا کوڈ یاد کرتے ہوئے ہم بوجھل سے دل سے میٹنگ میں جا بیٹھے کہ دیکھئے اب کیا تماشا ہوتا ہے۔ ذہن کسی منہ زور گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا۔ سب کوڈ گڈ مڈ ہو گئے۔ جن باتوں کی حمایت کرنی تھی۔ وہاں ٹھوک بجا کر مخالفت شروع کر دی اور جہاں مخالفت کرنی تھی وہاں حمایت میں ایسے ایسے دلائل دیئے کہ ہمیں خود اپنی شعلہ بیانی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ صاحب صدر پریشان کہ یہ کیا مصیبت مول لے لی۔ وہ دن اور آج کا دن کسی میٹنگ میں ہمیں بلانا تو دور کی بات ہے وہ صاحب ہمیں دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

ہمارے ایک جاننے والے کسی زمانے میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعروں اور مشاعروں کی صورت حال دیکھ کر شاعری سے کنارہ کشی کر لی ہے اور اب موسیقی کی ریاضت کر رہے ہیں۔ ہمارے تجسّس نے پھر ہمیں مزید کرید پر مجبور کر دیا۔ پوچھا کہ کوچہ عشاق سے کیوں نکل آئے۔ کیا پذیرائی نہیں ہوئی۔ کہنے لگے' جی یہ بات نہ تھی' شاعری کیا وہ تو نری مصیبت ہو گئی تھی' آخر روٹی کی فکر بھی کرنا ہوتی ہے۔ سارا دن کام کرتے تھکے ہارے گھر آؤ تو شام کو وقت گزاری کے لیے شاعر حضرات آ دھمکتے۔ شاعروں کے رخصت ہوتے ہی بیوی قوالی کرنے لگتیں۔ ہر ویک اینڈ پر کوئی نہ کوئی محفل۔ اتنا وقت کون نکالے۔

ہم نے نہایت افسردگی سے کہا کہ یہ تو شاعری چھوڑنے کا کوئی معقول جواز

نہیں ہے۔ ویسے بھی شاعری کو پکڑنا اور چھوڑنا کیا۔ یہ تو خود بندے کو پکڑتی بلکہ جکڑتی ہے۔ کہنے لگے آپ صحیح کہتی ہیں مگر مشاعروں میں جس طرح کے ایجنڈے چل رہے تھے ان سے طبیعت مکدر ہو گئی۔ ہم نے نہایت بے صبری سے پوچھا تو مشاعروں میں کیا ایجنڈے چلتے ہیں۔ کہنے لگے بھئی سو جھنجٹ ہیں۔ یہی کہ صدر کون ہو گا۔ مہمان خصوصی کسے بنائیں۔ کتنے مہمان خصوصی ہوں۔ نظامت کا فریضہ کون سرانجام دے گا۔ کس کی صدارت میں مشاعرہ پڑھنا ہے۔ کس کی نظامت میں نہیں پڑھنا۔ پھر تقدیم و تاخیر کے مسائل۔ کس کے شعروں پر داد دینی ہے اور کس کے شعروں پر منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھے رہنا ہے۔ چاہے کتنا ہی اچھا شعر ہو، کوئی داد فریاد نہیں ہونی چاہئے۔ طبیعت بہت زور مارے تو بس ہلکی سی آہ واہ کے سوا منہ سے اور کوئی آواز نہ نکلے۔ چاہے کتنا اچھا شاعر ہو، اگر اپنے دھڑے میں سے نہیں ہے تو اسے یوں گھور کر دیکھو کہ جیسے وہ اپنی پہلی غزل پڑھ رہا ہے۔ ہم نے احتجاج کیا کہ یہ تو سراسر ادبی بددیانتی ہے۔ اگر شعر اچھا ہے تو داد تو دینی چاہئے۔ ہنس کر کہنے لگے، جی آپ اس میدان میں نووارد ہیں۔ بس دیکھتی رہئے خود ہی سمجھ جائیں گی۔

ان کے اس دل شکن مشورے کے بعد ہم نے شاعری کو خبردار کر دیا ہے کہ ہمارے دروازے پر دستک نہ ہی دے تو اچھا ہے، کیونکہ اور بھی غم ہیں زمانے میں ایجنڈے کے سوا۔

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے
(میر تقی میرؔ)

ٹررن ٹررن

ٹیلی فون کی افادیت سے تو ہمیں انکار نہیں ہے مگراس کی ٹررن ٹررن نے ہماری زندگیوں میں جو ہلچل پیدا کر رکھی ہے وہ کبھی کبھی تو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ افادیت کا یہ سفر کہیں اذیت کا سفر تو نہیں بن گیا۔ پطرس بخاری نے تو مہمانوں کو بلائے جان کہا ہے مگر ٹیلی فون کا وقت بے وقت بلاوا بھی ہمیں بلائے جان سے کم نظر نہیں آتا۔

پرانے وقتوں میں جب ٹیلی فون سے آشنائی نہیں تھی تو کیسے کیسے خطوط لکھے جاتے تھے' بزرگ کیا کیا پند و نصائح کرتے' دوستوں عزیزوں کی تحریریں کیسے سنبھال کر رکھی جاتی تھیں جو نہ صرف بار بار پڑھی جاتیں بلکہ بوقت ضرورت ریفرنس کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں۔ گویا لکھنے والے کے لیے اپنی بات سے مکر جانا ممکن ہی نہ تھا۔

آہ! اس ٹیلی فون نے کیا کیا ستم ڈھائے ہیں' کیسی کیسی تحریریں مٹا دیں'

کتنے اچھے اچھے ہینڈ رائٹنگ خراب کر دیئے' لکھنے پڑھنے سے تو ہم ویسے ہی الرجک ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم خط پتر تو لکھ پڑھ لیتے تھے' اب یہ مشغلہ بھی جاتا رہا۔

اب تو رشتے ناتے' لڑائی جھگڑے' محبتیں' نفرتیں' مزاج پرسی' حتیٰ کہ شاپنگ تک فون پر ہی ہو جاتی ہے۔ کام کرنے والی ماسیاں کیسے جوان لڑکے لڑکیوں والے گھروں کے طواف کرتیں' پیغامات آتے' منہ میں گھی شکر ٹھونسے جاتے' ڈھولک پر تھاپ پڑتی اور ہر کس و ناکس کو پتا چل جاتا کہ ماسی اپنا کام دکھا گئی ہے۔ ٹیلی فون نے سب رونقیں اپنی گھنٹی میں باندھ لی ہیں۔

ہمارے خیال میں تو گراہم بیل کی اس ایجاد کا بہترین استعمال لڑائی جھگڑوں میں ہوتا ہے۔ کوئی شکر رنجی ہوئی جھٹ فون اٹھا کر جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ نہ آنکھ کی شرم' نہ سامنے والے کا لحاظ۔ آخر فون پر آواز کے سوا ہوتا ہی کیا ہے' اب صرف آواز کا لحاظ کون کرے!

کسی سے ناراضگی ہوئی جھٹ فون اٹھا کر کسی اور سے محو گفتگو' ایسے ایسے مسالہ جات لگا کر باتیں ہوتی ہیں کہ وہ مسالے ابھی تک دکانوں پر بھی دستیاب نہیں ہیں۔

ہمارے خیال میں آداب محفل کی طرح ٹیلی فون کے بھی آداب ہوتے ہیں گویا کسی کی خاندانی شرافت کا پتا بھی فون سے لگایا جا سکتا ہے یعنی فون کرنے والے نے کیسے' کس طرح اور کتنی دیر بات کی۔ فون بند کرنے سے پہلے اجازت لی یا منہ اٹھا کر بغیر کچھ کہے سنے چپل گھسیٹتے ہوئے چل دیئے۔

پرانی کہاوت ہے کہ مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا آپ کی مرضی سے ہے۔ جب آپ کسی کے ہاں فون کرتے ہیں تو گویا آپ ان کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ آپ سے بات چیت کر کے آپ کو مہمان ٹھہرایا جاتا ہے چاہے ہوا کی لہروں پر ہی۔ فون کے مہمان کو بھی چاہیے کہ شرفاء کے طور طریقے اپنائے' کیا ہوا اگر شکل نظر نہیں آ رہی ہوتی تو۔

میکے جانا لڑکیوں کے لیے ہمیشہ سے ہی محبوب مشغلہ رہا ہے' اب وہ فون پر جاتی ہیں۔ سسرال کی ساری کتھا فون پر ہی گوش گزار ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اگر وہ میکے جاتی بھی ہیں تو کرنے کو کوئی بات ہی نہیں ملتی' تھوڑی دیر بیٹھیں اور یہ کہتی ہوئی اٹھ جاتی ہیں اچھا اماں! فون پر بات کروں گی۔

کبھی کبھی تو فون کی گھنٹی بانگ دہل معلوم ہوتی ہے۔ ذرا باتھ روم گئے' ذرا کچن میں گھسے' فون نے آہ و فغاں شروع کر دی۔ گرتے پڑتے فون تک آئے' اب آگے سے کوئی بول ہی نہیں رہا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ایسے نابنجاروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم فون پر ان کا چوکھٹا دیکھنے سے تو رہے کہ صرف اسے ہی دیکھ کر خوش ہو جائیں' بات نہیں کرنی تو فون کی زحمت کیوں کی۔ دراصل ایسے کالرز کا مقصد ہی آپ کو زحمت دینا ہوتا ہے۔ اس طرح کی کالز کرنے والوں کو علم ہونا چاہیے کہ فون کی چند گھنٹیاں دوسروں کو کتنی دیر تک ذہنی اذیت میں مبتلا رکھتی ہیں۔

ٹیلی فون کرنے والوں کی شکایتیں بھی اپنی ہی قسم کی ہوتی ہیں۔ بھئی آپ تو کبھی گھر پر ملتی ہی نہیں ہیں یا اتنی گھنٹیاں بج رہی تھیں آپ نے فون دیر سے کیوں

اٹھایا؟ کیا بات ہے مری مری آواز میں کیوں بول رہی ہیں؟ سانس کیوں پھول رہی ہے؟ کیا بھاگ کر آئی ہیں؟ اب انہیں کیا بتایا جائے کہ اس فون کے چکر میں اس دل ناتواں پر کیا گزرتی ہے!

کچھ لوگ فون گھر پر ہونے کے باوجود پبلک فون سے ہی فون کریں گے۔ ہماری ایک عزیزہ اس کفایت شعاری مہم پر بہت دلجمعی سے عمل کرتی ہیں۔ ٹررن ٹررن... "ذرا شاپنگ کے لیے نکلی تھی سوچا حال پوچھ لوں"۔ ابھی ہم کوئی جواب بھی دے نہیں پاتے کہ کھٹ سے فون بند۔ دل چاہتا ہے کہ ان سے پوچھیں آپ گھر سے ہمارا حال پتا کر کے کیوں نہیں نکلتیں' یہ بیچ چوراہے میں ہمیں کیوں رسوا کرتی ہیں۔ ابھی سانسیں درست نہیں ہونے پاتیں کہ کال داغ مفارقت دے گئی اور ہم بڑی حسرت سے ریسیور کو تکتے رہ جاتے ہیں کہ اس کال کی بس اتنی ہی زندگی تھی۔

رانگ نمبر تو پریشان کرتے ہی ہیں مگر وہ فون بھی کم پریشان کن نہیں ہوتے جو کیے تو صحیح نمبر پر ہی جاتے ہیں مگر رانگ وقت پر آتے ہیں۔ رات کے دو تین بجے آنے والے فون کی ٹررن ٹررن سن کر لگتا ہے کہ خواب میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ شاید اللہ میاں کی طرف سے فون آیا ہو۔

اتنی رات گئے آنے والے کالر کے ساتھ جس قسم کا مکالمہ حالت نیند میں ہو سکتا ہے آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہماری ایک دوست امریکہ میں رہتی ہیں۔ (شکر ہے ایک ہی دوست امریکہ میں ہیں' چند اور ہوتیں تو ہم تو گئے تھے کام سے) جب بھی فون کریں گی

شب خون ہی ماریں گی۔ ایک مرتبہ تو ہم نے جل کر کہہ دیا "یار تم اپنی ڈائری میں لکھ کر رکھ لو کہ انگلینڈ اور امریکہ کا ٹائم ڈفرنس کیا ہے"۔ مسکرا کر کہنے لگیں "وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن دن کے وقت میں آفس میں ہوتی ہوں"۔ (تو گویا ہم رات میں آفس جاتے ہیں) سبحان اللہ! کیا آگہی ہے، ہم سمجھے محترمہ بے خبری میں وقت بے وقت فون کرتی ہیں مگر یہاں تو ہم ہی بدھو نکلے!

کچھ کالرز تو بالکل فارغ ہو کر کافی کا کپ پاس رکھ کر فون کرتے ہیں۔ کتنی ہی جان چھڑاؤ بات ہی نہیں بنتی۔ اب ہم مروت کے مارے کھل کر کہہ بھی نہیں پاتے کہ ہم کوکنگ کر رہے تھے اور ہماری ہنڈیا ہماری منتظر ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں اکثر ہماری ہنڈیا ہماری جدائی میں جل کر کباب ہو جاتی ہے۔ ہمارے میاں کہتے ہیں کہ تم زیادہ کوکنگ پوٹس اسٹور کر کے رکھو کیونکہ ہر روز تین نہیں تو دو برتن تو تم جلا ہی دیتی ہو۔ ہم نے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے نہ صرف ہر سائز اور ہر شکل کی دیگچیاں اسٹاک کر لی ہیں بلکہ ایک ہی دن میں کم از کم تین طرح کے سالنوں کی تیاری کر کے رکھتے ہیں۔ گوشت جل گیا تو سبزی کا نمبر، سبزی دغا دے گئی تو دال اور اگر وہ بھی بے وفا نکلی تو انگلش ڈنر۔

سارا ہفتہ تواتر سے جلنے والی دیگچیوں کو ہم صحن میں ایک قطار میں رکھتے جاتے ہیں، ویک اینڈ پر ہمارا سب سے پہلا کام جلی بھنی دیگچیوں کو راضی کرنا ہوتا ہے۔ وقت گزاری کے لیے ہم باآواز بلند گاتے جاتے ہیں "دیور گڑا انہاں نوں دیور گڑا"۔ شکر ہے پڑوس میں انگریز رہتے ہیں ورنہ نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

فون کا صحیح استعمال ہماری ینگ جنریشن کرتی ہے۔ ہاہا، ہی ہی، ہو ہو، جیسی

آوازیں سن کر لگتا ہے کہ جنریشن گیپ کس قدر کم ہو گیا ہے بلکہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ ہی نہیں رہا' اپنی دھن میں لگے ہوتے ہیں' لاکھ آنکھیں دکھاؤ وہ آپ کی طرف دیکھیں گے ہی نہیں۔ لمبے لمبے بل جب مہینے کے آخر میں آپ کی طبیعت کو باغ و بہار کریں گے تو یہ صرف سوری ممی کہہ کر چل پڑیں گے۔

ابھی تک تو خیریت ہے' ہمیں تو اس وقت کا سوچ کر ہول آتا ہے جب فون پر تصویر بھی آیا کرے گی۔ خواتین کی جان تو ویسے ہی مصیبت میں رہتی ہے بننے سنورنے کے ہاتھوں' پھر وہ سر جھاڑ منہ پھاڑ فون تک بھی نہیں آپائیں گی۔ صبح سویرے اٹھ کر میک اپ کا بریک فاسٹ کرنا پڑے گا' معلوم نہیں کب گھنٹی بج اٹھے!

ادھر موبائل فون نے الگ دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ کہیں چھپ جاؤ لوگ ڈھونڈ ہی نکالیں گے۔ آخر پرائیویسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس نامعقول ایجاد کی کیا ضرورت تھی۔

ہمارے خیال میں تو گراہم بیل نے فون صرف ایمرجنسی کے لیے ایجاد کیا ہو گا مگر ہم نے اس کی کیا درگت بنا دی ہے اور ویسی ہی درگت اس نے ہماری بنا دی ہے۔ اگر اس کا موجد زندہ ہوتا تو یقیناً ہم پر اپنی ایجاد کے اس قدر عامیانہ سلوک پر ہتک عزت کا دعویٰ دائر کرتا اور انجمن انسداد بے رحمی ٹیلی فون بنا کر اپنی ایجاد کی جی جان سے حفاظت کرتا۔

میری آنکھ دیکھتی ہے نئے موسموں کے منظر
جو طلوع ہو رہے ہیں یہ سبھی ہیں خواب میرے

(ادا جعفری)

قدموں تلے

پتا نہیں لوگ جوتی کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں۔ پاؤں میں جوتا نہ ہو تو چار قدم چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جوتی ہماری زندگی میں اتنی اہم ہے کہ اس کے محاوروں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ پھر بھی اسے وہ سٹیٹس نہیں مل سکا جس کی یہ مستحق ہے اور کچھ ہو نہ ہو مگر ایک بات اس کے بارے میں وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جب تک یہ پیر میں رہے تو جوتی رہتی ہے اور سر پر پڑے تو چھٹی کا دودھ یا نانی یاد آ جاتی ہے۔ آخر مصیبت میں نانی ہی کیوں یاد آتی ہے' دادی یا پھوپھی کیوں یاد نہیں آتی۔ دراصل نانی کا ماں سے بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے مصیبت یا افتاد میں سب سے پہلے اللہ اور پھر ماں کا نام منہ سے نکلتا ہے۔

خیر بات تو جوتی کی ہو رہی تھی ہم کہاں سے کہاں نکل گئے۔ جوتی اس لیے بھی کام کی چیز ہے کہ اس میں دال بھی بٹتی ہے۔ آج تک یہ پتا نہیں چلا کہ دال مسور کی ہوتی ہے یا کوئی اور۔ ویسے مسور کی دال کے ساتھ بھی لوگ جوتی جیسا

سلوک کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مسور کی دال بھی اپنا مقام اور اہمیت رکھتی ہے جیسے ایک خوش خوراک نواب صاحب نے مسور کی بہت اچھی دال پکانے والے خانساماں کی شہرت سن کر اسے بھی درباری خانساماؤں میں شامل کرلیا مگر بہت عرصہ تک بیچارے خانساماں کو اپنے فن کی داد وصول کرنے کا موقع نہ ملا۔ دبی دبی زبان سے نواب صاحب سے شکایت بھی کی، خیر ایک دن ان کی باری آہی گئی۔ بڑے طمطراق سے مسور کی دال پکائی گئی مگر دسترخوان پر پڑی پڑی دال بیچاری ٹھنڈی ہوگئی اور کھانے کی نوبت نہ آئی۔ اس پر وہ شاہی خانساماں بہت بھنائے اور نواب صاحب کو یہ کہہ کر چلتے بنے کہ "یہ منہ اور مسور کی دال۔"

یہ تو تھی محاورے کی بات، جوتیوں میں دال اکثر جگہوں میں بٹتی رہتی ہے۔ مثلاً گھروں کے اندر یا پھر کمیونٹی میں بہت زور و شور سے اس کی بانٹا بانٹی ہوتی ہے۔ اس کے لیے برطانیہ میں ہماری کمیونٹی پیش پیش ہے۔ گھروں میں بٹنے والی دال اکثر ساس بہو، بھابی اور نند یا پھر دیورانیوں، جیٹھانیوں میں بٹتی ہے۔ کبھی کبھار یہ بہن بھائیوں میں بھی بٹتی ہے، خاص طور پر جب والدین کی وراثت یا جائیداد کے بٹوارے کا وقت آتا ہے۔ بقول کچھ لوگوں کے والدین کی جائیداد نری مصیبت ہے اولاد کے لیے، اس خیال سے کچھ دور اندیش والدین جائیداد بناتے ہی نہیں ہیں تاکہ ان کے مرنے کے بعد ان کے لخت جگر لڑائی کی زحمت سے بچ جائیں۔ لیکن والدین ایک نقطہ بھول جاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس مال و دولت ہو تو ان کی اولاد ان کے گرد زیادہ طواف کرتی رہتی ہے، بڑھاپے میں ان کا خیال اور کچھ نہیں تو اسی لالچ میں زیادہ رکھتی ہے کہ جو ان کی خدمت خاطر زیادہ

کرے گا زیادہ مال بھی وہی بٹورے گا۔ اس کے برعکس غریب والدین اکثر ہی کسمپرسی کی زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔ کئی تو یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ آخر انسان کو اپنے بڑھاپے کے لیے کچھ تو فکر کرنی چاہیے' یہ کیا کہ بیٹوں پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ آخر ہماری بھی تو ذمہ داریاں ہیں۔ والدین کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے' اس پر ضرور غور کریں!

بیچاری عورت کو بھی اکثر و بیشتر پاؤں کی جوتی سے تشبیہ دی جاتی ہے مثلاً عورت تو پیر کی جوتی ہے جب چاہو بدل لو یا پھر پیر کی جوتی سر پر نہیں رکھی جاتی۔ اب ہمیں یہ پتا نہیں کہ عورت جوتی کون سی ہوتی ہے؟ پاکستانی جو چند دفعہ پہن کر ہی داغ مفارقت دے جاتی ہے' انگریزی جو موسم کی سختیاں برداشت کرتی ہے یا پھر اٹلی کی بنی ہوئی جوتی جو سب سے زیادہ مہنگی اور دیدہ زیب ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں تو ہماری عورت یقیناً انگریزی جوتی ہوتی ہوگی۔ سخت جان' ہر دکھ سکھ میں ساتھ دینے والی' قدم سے قدم ملا کر چلنے والی..... اب یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں جوتی پیچھے رہ جاتی ہے اور پاؤں نکل کر آگے چل پڑتا ہے' ایسے پاؤں کو پابند سلاسل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" مگر ہمارے خیال میں اس محاورے کو یوں ہونا چاہیے کہ "جوتی رے جوتی تیری کون سی کل سیدھی" کیونکہ جب بیچاری عورت کو اس سے تشبیہ دی جائے گی تو اسے اس کا کچھ تو بھرم رکھنا ہی ہوگا۔ اسی لیے عورت کی سیدھی کل کا بھی مردوں کو آج تک پتا نہیں چلا۔ ویسے عورت ٹیڑھی کل ہی میں بہتر رہتی ہے کیونکہ جو اس

کو سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا وہ ٹوٹ جائے گی' بالکل پسلی کی ہڈی کی طرح اس لیے عورت کے ٹیڑھ پن سے ہی عقل مند کام چلا لیتے ہیں اور جو بالکل ناک کی طرح اسے سیدھا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں وہ اسے توڑ بیٹھتے ہیں اور پھر خود بیٹھ کر روتے ہیں جیسے شریر بچے پہلے کھلونے توڑ لیتے ہیں اور پھر منہ بسورنے لگتے ہیں۔

خوش لباس لوگ تو جوتی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی انسان کی ذاتی صفائی کا معیار دیکھنا ہو تو اس کے جوتے دیکھو کہ کتنے صاف ہیں۔ بقول ان کے گندے جوتے میں ایک اچھا دماغ رہ ہی نہیں سکتا۔ اچھا ہو گا بھی تو جوتوں کی خوشبو سے باغ و بہار بنا رہے گا۔ جوتوں پر یاد آیا کہ ایک دن ہمارے میاں جوتوں کو خوب لشکارہے تھے' ہم نے ٹوکا تو کہنے لگے "اوئے بھلیئے لوکے تینوں نہیں پتا اسی لگدیاں پھبدیاں والے آں' دشمن دی نظر پہلاں جوتی تے فیر منہ تے جاندی اے۔" (یعنی کہ او بھلی عورت ہم دشمن دوست سبھی رکھتے ہیں اور دشمن کی پہلی نظر انسان کے جوتے پر ہی جاتی ہے اور پھر منہ پر پڑتی ہے۔) ہم اس نئی تھیوری کو سن کر بالکل خاموش ہو گئے تب سے ہم جوتے کی اہمیت کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے تھے' آج نقطہ ہاتھ لگا تو لکھنے بیٹھ گئے۔

جوتوں کی بارش بھی ہوتی ہے جیسے سیاستدانوں پر گندے انڈوں اور ٹماٹروں کی بارش ان کی ناراض رعایا کرتی ہے مگر ایک بات ہے کہ سیاستدانوں میں دال جوتیوں میں نہیں بٹتی بلکہ ان میں پلاٹ بٹتے ہیں مگر برطانیہ میں تو پلاٹوں کا جھنجھٹ نہیں ہے اس لیے یہاں کے کمیونٹی لیڈروں میں اور خاص طور پر

مسجدوں میں دال اکثر جوتیوں میں بٹتی رہتی ہے۔ ویسے تو مسجد میں جوتا پہن کر جانا منع ہے آخر خدا کے گھر میں کچھ تو ادب ملحوظ خاطر ہونا چاہیے مگر دال بانٹنے کے لیے جوتا اندر لے جانے کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ اکثر یہ دال کچی ہی بٹتی ہے پھر اس میں مرچیں، ہلدی، نمک ڈال کر پریشر ککر میں ڈالا جاتا ہے۔ غلطی سے یہ مسالہ جات، خاص طور پر مرچیں، کبھی کبھی لوگوں کی آنکھوں میں بھی پڑ جاتی ہیں جسے دیکھ کر پولیس دندناتی ہوئی جوتوں سمیت اور کبھی کبھی جوتے اتار کر مسجدوں میں گھس آتی ہے اور "سر منڈاتے ہی اولے پڑے" والا محاورہ یہاں الٹ ہو جاتا ہے کہ دال پکاتے ہی جوتے پڑے۔

غرضیکہ اس جوتم پیزار، آدم بیزار، گل و گلزار، ہستی ناپائیدار نسل انسانی کا جوتوں کے بغیر گزارا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جب کسی کو طعنہ دینا ہو اس کی ناکامی پر تو لوگ کہتے ہیں "اپنا جوتا اپنے ہی منہ پر پڑا ہے"۔ اب یہ الگ بات ہے کہ جوتا پڑنے سے منہ پر کچھ فرق پڑے نہ پڑے کیونکہ بقول کسی کے کچھ لوگوں کے منہ ہی ٹوٹے چھتر ورگے ہوتے ہیں۔ ٹوٹے چھتر کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اس لیے لوگ کسی کی سرزنش کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ تم ٹوٹے چھتر کی طرح بڑھتے ہی جا رہے ہو۔ یہ چھتر اس وقت یقیناً زبردست ہوتا ہے جب یہ پاکستانی پولیس کے ہاتھ میں ہو جس پر لکھا ہوتا ہے "آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے۔" عجیب بات ہے جوتوں کو بھی لوگوں کا انتظار رہتا ہے۔

کسی کی نازیبا حرکت پر گلے میں پھولوں کے ہار کی بجائے جوتوں کا ہار بھی ڈالا جاتا ہے مگر یہ دولہا ہرگز نہیں ہوتا کیونکہ شادی کرنا نازیبا حرکت کے زمرے

میں نہیں آتا۔ دولہا کے سر پر سہرا سجایا جاتا ہے جبکہ مجرم کا منہ کالا کر کے نحیف و نزار سی گدھی / گدھے پر بٹھا کر سارے گاؤں کا چکر لگایا جاتا ہے۔ یہ تماشا شہروں میں نہیں ہوتا کیونکہ وہاں پولیس جلدی پہنچ جاتی ہے اور مجرم کو لوگوں کے نرغے سے نکال کر اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے جہاں اس کی تواضع اور طرح سے ہوتی ہے۔

جوتوں کی اعلیٰ اور خاندانی قسم سلیم شاہی جوتے ہیں جو شاید شہزادہ سلیم کے لیے ایجاد ہوئے تھے کیونکہ انارکلی کے عشق میں اکبر بادشاہ سے جوتوں کے سوا انہیں اور کیا مل سکتا تھا' اسی لیے یہ جوتے نفیس' نازک اور ہلکے پھلکے بنائے گئے کہ اگر شہزادے کو مارنے کی نوبت آئے تو چوٹ زیادہ نہ لگے' آخر نازو نعم میں پلا ہوا شہزادہ ہے مذاق تو نہیں۔ برطانیہ میں ہمارے ہاں کے اکثر والدین بچوں پر جوتا اٹھاتے تو ہیں مگر ڈرا دھمکا کر نیچے رکھ دیتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ مارنے کی صورت میں یہ جوتا گلے کا ہار بن جائے گا۔ اب گلے میں جوتوں کا ہار پہننے سے تو رہے اس لیے اس نادر شاہی حرکت سے گریز ہی کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ پاؤں کی جوتی کو سر پر نہیں رکھا جاتا' بوقت ضرورت یہ حرکت بھی کرنا پڑتی ہے کیونکہ ہم نے دیہاتیوں کو سفر کے دوران یعنی پاپیادہ جوتوں کو بغل میں لیے اور بارہا سر پر رکھے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ بیچارے سادہ لوح لوگ ہیں' یہ نہیں جانتے کہ محاورے کی رو سے یہ غلط اور ناقابل قبول فعل ہے۔

نئی جوتی اور نئی بیوی دونوں تنگ کرتے ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کے دم خم نکل جاتے ہیں اور دونوں ہی بے دم ہو کر مالک کے مرہون منت

ہو جاتے ہیں۔ جوتوں کی چوری بھی بہت مشہور ہے مگر پرانے جوتوں کی نہیں، یہ خطرہ صرف نئے جوتوں کو لاحق ہوتا ہے۔ جوتوں کی چوریاں اکثر مساجد میں ہوتی ہیں اور جوتے چرانے والے کو گھٹیا قسم کا چور سمجھا جاتا ہے جو لوگوں کی بددعاؤں کے علاوہ خدا کے غضب کو بھی دعوت دیتا ہے۔

جوتوں کو بطور تحفہ دیتے ہوئے کم ہی دیکھا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سے تحفہ وصول کرنے والے کی بے عزتی ہوتی ہے۔ نہ جانے کیا مطلب پہنا لیے جائیں اس تحفے کو۔ لیکن اکثر لوگوں کو اپنے پیرو مرشد کے جوتوں کو بھی سینے سے لگائے دیکھا ہے۔ ہمارے ایک بزرگ جب برطانیہ آئے تو اپنے پیرو مرشد کے جوتے بھی عقیدت کے طور پر لیتے آئے۔ انہیں اپنی زندگی میں مرشد سے دوبارہ ملنے کا موقع تو نہیں ملا مگر ان کے جوتوں کو ایسے ہی پیار سے رکھتے اور دیکھتے تھے جیسے مرشد سامنے بیٹھے ہوں۔ ایسی عقیدتیں اب کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ جوتے پہننے والوں کے حساب سے جوتوں کی بھی درجہ بندی یعنی کلاس ہوتی ہے مگر ان میں مفلس ترین جوتے وہ ہوتے ہیں جنہیں ان کے مالک پیچھے چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور وہ پہننے والے کی ناقدری پر اشکبار رہتے ہیں۔ جوتوں کو ایسے دکھ سے دوچار نہیں کرنا چاہیے، بہتر یہی ہے کہ جوتے سر پر رکھ کر سرپٹ دوڑ لگا دی جائے تاکہ یہ بے ضرر سی چیز آخری دم تک اپنے مالک کے قدموں سے لپٹی رہے۔

سیف انداز بیاں بات بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں
(سیف الدین سیف)

تقریر کی لذت

رچرڈ اشبرن چائلڈ کا کہنا ہے کہ "دل سے اٹھنے والی وہ آواز جو آپ لوگوں کو سنانا چاہیں تقریر کہلاتی ہے۔" مگر تقریر کرنا بھی ایک فن ہے جو ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر شخص کو زندگی میں تقریر کرنے کا شوق کبھی نہ کبھی ضرور چراتا ہے۔ کچھ لوگ تو اس پل صراط سے بخیرو خوبی گزر جاتے ہیں اور کچھ ایسی کھائی میں گرتے ہیں کہ زندگی بھر تقریر کرنا تو دور کی بات ہے تقریر سننے سے بھی گریزاں ہوتے ہیں۔

کچھ اس قسم کا شوق ہمیں بھی لاحق ہوا تھا' ویسے تو شوق لاحق نہیں ہوا کرتا صرف مرض لاحق ہوتا ہے' مزے کی بات یہ ہے کہ یہ مرض اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتا جب تک بندہ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار نہیں کر لیتا کیونکہ بندے کے خیال میں اگر اس آزمائش سے نہ گزرے تو شاید دنیا ایک بہت بڑے مقرر سے محروم رہ جائے گی۔

اس محرومی کا ازالہ کرنے کے لیے ہم بھی ایک مرتبہ تقریر کے میدان جنگ میں کود گئے۔ شکر ہے وہ طالب علمی کا زمانہ تھا' اس زمانے میں ہونے والی حماقتیں اتنی قابل گرفت نہیں ہوتیں۔ صلاحیتوں کے پر کھولنے کے اس دور میں اگر اڑنا سیکھ گئے تو کیا ہی بات ہے اور گر پڑے تو پھر بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر زندگی تعلیمی اداروں تک تو ختم نہیں ہو جاتی' اصل زندگی تو علم و دانش کی درسگاہوں سے باہر کروٹیں لے رہی ہوتی ہے جو اس کٹھالی میں تپ گیا سمجھو سنہرا ہی سنہرا ہو گیا۔

اسی نظریے پر عمل کرتے ہوئے ہم نے باہوش و حواس کالج کے ایک تقریری مقابلے کے لیے اپنا نام دے دیا۔ گھر والوں کو بتانے کی دیر تھی کہ سب پنجے جھاڑ کر ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ جب کبھی تقریر کی ہی نہ تھی تو اس دیدہ دلیری کی کیا ضرورت تھی۔ اس اچانک حملے سے ہم اس قدر گھبرا گئے کہ ہمیں یوں لگا جیسے جرم کر کے ہم نے خود اپنے خلاف ایف آئی آر کٹوالی ہو۔

ہم میں ایک بری عادت ہے' جہاں کسی نے ہماری مخالفت کی ہمارے ارادوں میں اور پختگی آ جاتی ہے۔ ہمارے ہمالیہ پہاڑ سے بلند ارادوں کو دیکھ کر گھر والے زیر لب مسکرا کر رہ گئے۔ ہم نے دل ہی دل میں سوچا کہ ابھی سے رعب پڑ گیا ہے اور جب ہم انعام جیت کر ایک احساس تفاخر کے ساتھ گھر میں وارد ہوں گے تو پھر مزہ آئے گا۔

تقریری مقابلے کے لیے نام دیتے وقت ہم نے بالکل بھی نہیں سوچا کہ تقریر کرنے سے پہلے لکھنا پڑتی ہے۔ ہمارا خیال تھا یہ کار خیر کالج والے ہی انجام

دیں گے اور ہمیں صرف اپنی شعلہ بیانی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ تقریر لکھنے کے خیال سے ہی ہمیں گھبراہٹ ہونے لگی۔ پورے خاندان پر نظر دوڑائی مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر ہم سوچنے لگے کہ کیا ہمارا تقریر کرنے کا فیصلہ صحیح بھی ہے۔ ذہن عجیب کشمکش کا شکار ہو گیا۔ دل نے بھی ہوشیاری پکڑ لی۔ ذہن کہتا بند کرو یہ بکواس، تم تقریر نہیں کر سکتیں۔ دل کہتا آگے بڑھو اور دشمن کی صفوں کو چیرتی ہوئی نکل جاؤ۔ دل و دماغ کے گرما گرم مکالمے سن کر ہم نے خود سے کہا باز آجاؤ ابھی بھی وقت ہے 'ڈھلے بیراں دا کج نئیں گیا' مقابلے سے نام واپس لینے میں بس تھوڑی سی خفت محسوس ہوگی مگر یہ اس شرمندگی سے بدرجہا بہتر ہے جو تقریر کی ناکامی پر ہمیں اٹھانا ہوگی۔

قصہ مختصر تمام رات دل و ذہن ماسٹر مائنڈ بنے رہے، اس سوال و جواب سے تنگ آکر ہم نے تقریر نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور لائٹ آف کر کے سونے کی کوشش کی مگر جیسے ہی بستر پکڑا تھوڑے تھوڑے وقفوں سے دماغ میں مختلف پاورز کے بلب روشن ہونے لگے۔ اچانک یوں لگا کہ چار سو چالیس وولٹ کی طاقتور لہر دل و دماغ میں سے گزر گئی ہو۔ ہمارے ضمیر کی ہیبت ناک آواز نے تو ہماری جان ہی نکال لی۔ یہ کیا بے ہودگی ہے، تمہیں تقریر کرنی ہے، ہر قیمت پر۔ زمانہ طالب علمی سے بہتر موقع تمہیں اور کہیں نہیں مل سکتا، بعد میں یہ حالت ہو جائے گی کہ تم تقریر کرنے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپو گی مگر مقررین کی قطار اس قدر طویل ہوگی کہ خوش قسمتی سے اگر موقع مل بھی گیا تو تمہاری باری آنے تک پنڈال خالی ہو چکا ہوگا۔

قطار سے ہمیں یاد آیا کہ ایک مرتبہ برطانیہ میں ہمیں اپنی کمیونٹی کی ایک تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ یہ کسی سماجی کارکن کے اعزاز میں عشائیہ تھا۔ جیسے ہی ہال میں داخل ہوئے تقریر کرنے والوں کی لمبی قطار کرسیوں پر قبضہ کیے بیٹھی تھی۔ یہ سب مقامی مقررین بلکہ معززین تھے اور ان سب کے نرغے میں پھنسے ہوئے مہمان خصوصی کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا۔ شاید اس غم میں گھلے جارہے تھے کہ تھوک کے حساب سے بیٹھے ہوئے مقررین کی موجودگی میں ان کی باری کب آئے گی۔ ہال سے ملحقہ کمرے سے طرح طرح کے کھانوں کی خوشبوئیں مشام جاں کو معطر کر رہی تھیں یعنی منتظمین نے کھانا کھلانے سے قبل تقریریں سننے بلکہ سہنے کی شرط عائد کر رکھی تھی۔ اوپن ایئر رشوت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر ہمیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ہم کس قدر کرپٹ ہو گئے ہیں۔

ہم گئے تو تھے مہمان خصوصی کی زیارت کرنے اور ان کی بات چیت سننے مگر دوسرے مقررین نے وہ ہاہاکار مچائی کہ خدا کی پناہ! ایک مولانا قسم کے مقرر نے تو حد ہی کر دی، تقریر کرتے ہوئے چک سواری سے چاندنی چوک، بھاٹی گیٹ اور براستہ لالوکھیت ہوتے ہوئے مکہ مدینہ پہنچ گئے۔ سب حیران و پریشان کہ یہ گاڑی کانٹے پر کانٹا کیوں بدل رہی ہے۔ مولانا جوش خطابت میں یوں گرج برس رہے تھے جیسے ان سماجی کارکن کو ڈانٹ پلا رہے ہوں کہ ہماری موجودگی میں تم نے یہاں آکر تقریر کرنے کی جرات کیسے کی۔ اسی اکھاڑ پچھاڑ میں ان کی سانس پھول گئی، شاید دمے کا پرانا مرض عود کر آیا تھا۔ رکتی ہوئی سانسوں کے ساتھ

انہوں نے منتظمین سے پانی کی بجائے کوکاکولا مانگا اور کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔

ہمارا خیال تھا کہ مولانا کی حالت سے تقریر کے انتظار میں بیٹھے ہوئے حضرات عبرت پکڑیں گے مگر کسی دوسرے کے تجربے سے سبق سیکھنا تو ہم نے شاید سیکھا ہی نہیں۔ زیادہ تر مقررین منتظمین کے دوست احباب تھے یا وہ کمیونٹی لیڈرز جن کی ناراضگی مول لینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لطف کی بات یہ تھی کہ مقررین مہمان خصوصی کے بارے میں بات کرنے کی بجائے منتظمین کے آباءو اجداد کے اوصاف حمیدہ گنوا رہے تھے۔ اس نازک صورت حال کو دیکھ کر ہم نے ایک پرزہ نظامت کرنے والے صاحب کو بھجوا دیا جسے پڑھتے ہی ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا جبکہ پاس بیٹھے ہوئے مہمان خصوصی کے چہرے پر کئی مسکراہٹیں بکھر گئیں۔ انہوں نے اسی گھبراہٹ میں باقی ماندہ مقررین پر لعنت بھیجتے ہوئے مہمان خصوصی کو تقریر کی دعوت دے ہی ڈالی۔

بات تو ہو رہی تھی ہماری تقریر کی، اور ہم لگ گئے ادھر ادھر کی ہانکنے۔ آپ سمجھے ہوں گے کہ ہم اپنی تقریر کی روئیداد سنانے سے بچنا چاہتے ہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے نہایت عرق ریزی سے بالاخر تقریر تیار کر ہی لی۔ اتنی محنت کرنے پر ہمیں یقین تھا بلکہ یقین کامل تھا کہ پہلا نہیں تو دوسرا انعام تو ہمیں مل ہی جائے گا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر، ہاتھ ہلا ہلا کر، مسکراہٹوں کے نئے نئے زاویے بنا کر ہم نے کچھ اس طرح مشق ستم کی کہ اپنے ہوشربا قسم کے پوز دیکھ دیکھ کر ہمیں خود پر پیار آنے لگا۔ ہم نے سوچا اگر بند کمرے میں یہ حال ہے تو باہر تو تباہیاں ہو جائیں گی اور عین ممکن ہے کہ کچھ دل پھینک قسم کی لڑکیاں ہم پر

عاشق بھی ہو جائیں۔ (جی ہاں لڑکیوں کے کالج میں صنف مخالف کا داخلہ ممنوع ہے اس لیے یہ فریضہ بھی صنف نازک کو ہی انجام دینا پڑتا ہے)

ہمیں مشہور مفکر ڈی ایلگنی کا قول اچھی طرح یاد تھا کہ "فن خطابت اولاد آدم کی روحوں کو حیرت زدہ کر دینے والی قوت کا نام ہے۔" اپنے فن خطابت سے حیرت زدہ کرنے کے لیے ہم نے ایک دن اپنی بہت اچھی دوست کو گھر پر مدعو کر لیا۔ اب جو ہم نے تقریر شروع کی اور غضب کے پوز مارنے شروع کیے تو ہماری دوست پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگیں۔ جیسے ہی ہم نے تقریر ختم کر کے ان سے داد چاہی وہ سخت برہم ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "یہ کیا تماشا ہے' یہ تقریر ہے یا نوٹنکی؟" ہم نے نہایت بھولپن سے پوچھا "کیوں کیا ہوا' کیا ہم بہت اچھی تقریر کر رہے تھے؟" جل کر بولیں "خاک اچھی تھی' تمہیں تو ایکٹنگ کرنے سے ہی فرصت نہیں تھی تو الفاظ پر تم کیا توجہ دیتیں۔ بہتر ہو گا کہ تم کالج کے سالانہ ڈرامے میں حصہ لے لو' شاید حوصلہ افزائی کا انعام مل جائے۔"

ہماری دوست کی حوصلہ شکن رائے نے ہمیں تو لرزا کر رکھ دیا۔ یا اللہ! اب کیا ہو گا' صرف ایک رات میں ہم تقریر کرنے کا نیا انداز کہاں سے ڈھونڈیں گے' ریہرسل کب کریں گے! ہماری پریشانی دیکھ کر وہ گویا ہوئیں "تم جانتی ہو کہ الٹی سیدھی تیاری سے حاضرین کے سامنے جا کھڑا ہونا ایسے ہی ہے جیسے بندے نے آدھا لباس پہنا ہو۔" اب تو ہمارے صبر کا جام بھی ہلکورے لینے لگا' ہم نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ "اللہ میاں نے کیا تمہیں تنقید کرنے کے لیے ہی بنایا ہے' ذرا حوصلہ افزائی نہیں کر سکتیں یا اس کی بھی کوئی فیس ہے جو آپ کو ادا کرنا

پڑے گی۔ اور تو اور یہ آدھے اور پورے لباس کا کیا معاملہ ہے" ہم نے بھی جل کر کہا "ٹھیک ہے ہم برقع پہن کر بلکہ نقاب گرا کر تقریر کرلیں گے تاکہ آدھے پورے لباس کا قصہ ہی ختم ہو جائے۔" ہماری اس غیر متوقع گولہ باری سے ڈر کر ہماری دوست تو گھر کو سدھاریں مگر ہمیں ایک نئی اذیت سے دوچار کر گئیں۔

دوسری صبح ہم نے اپنے نیم مردہ جسم کو یوں بستر سے گھسیٹ کر نکالا جیسے مجرم کو تختہ دار پر لے جایا جا رہا ہو۔ گرتے پڑتے تیار ہوئے' اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ کالج پہنچے تو پنڈال میں خوش گپیوں میں مصروف لوگوں کو دیکھ کر ہمارا تو دل ہی بیٹھ گیا۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا' ٹانگیں لرزہ براندام' دماغ ایسے جیسے کنکورڈ' جمبو جیٹ اور بوئنگ سب ایک ہی وقت میں ہمارے سر پر لینڈ کر رہے ہوں۔ گویا ہمارا سر نہ ہوا بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہو گیا۔ اسی شاں شوں میں ہمارا نام پکارا گیا' ہم روسٹرم تک پہنچ تو گئے پھر پتا نہیں کیا ہوا! ہوش آیا تو اپنے بستر پر تھے اور ہماری دوست ہمارے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم نے بے قرار ہو کر پوچھا "ہم نے کیسی تقریر کی؟" مسکرا کر کہنے لگیں "آپ نے تقریر نہیں ڈرامہ کیا تھا' ایکٹنگ تو جیسی بھی تھی مگر آپ کی مسکراہٹ لاجواب تھی۔" ہم نے شرما کر کہا "ہم نہ کہتے تھے کہ ہم میں بہت ٹیلنٹ ہے' بس ذرا سی حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی۔"

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے
(ناصر کاظمی)

ولایتی چوزے

آج تک یہی سنتے آئے تھے کہ بچے کسی بھی قوم' مذہب یا معاشرے سے تعلق رکھتے ہوں وہ بچے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے رنگ لال گلابی' کالے' سفید یا براؤن تو ہو سکتے ہیں مگر عالمی طور پر ان کے مزاج' عادات' طرز فکر اور حرکات و سکنات میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ مگر کچھ عرصہ پہلے بچوں کی ایک نئی قسم دریافت ہوئی ہے جنہیں ولایتی بچے یا ولایتی چوزے کہتے ہیں۔ بچپن میں ولایتی مرغی کے چوزے دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ انہیں دیکھتے ہی رہیں۔ بالکل روئی کے گالوں جیسے نازک' نفیس اور ان کی نگہداشت بھی بہت اعلیٰ طریقے سے کی جاتی تھی۔ ان کی نازبرداریوں سے ہمارے معصوم دل سے ایک آہ نکلتی اے کاش! ہم بھی ولایتی مرغی کے ولایتی بچے ہوتے مگر یہ حسرت آج تک حسرت ہی ہے اور اس کے پورا ہونے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی۔

ولایت میں آکر ولایتی مرغی کے بچے تو آج تک نظر نہیں آئے مگر ولایتی

انسانی بچے قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ معاف کیجئے یہ انگریزوں کے بچے نہیں ہیں' یہ ہمارے پاکستانی بھائی بندوں کے یہاں پروان چڑھنے والے بچے ہیں جنہیں عرف عام میں ولایتی بچے کہا جاتا ہے مگر ہم انہیں ولایتی چوزے کہتے ہیں۔ یہ بچے اپنی مادری زبان کو کمتر سمجھتے ہوئے صرف انگریزی میں ہی بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ انگریزی میں گٹ پٹ کرتے ہوئے دیکھ کر ان کے دیسی والدین بہت خوش ہوتے ہیں' ان میں سے کچھ والدین تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور کچھ نے سکول کالج کا منہ بھی نہیں دیکھا ہوتا' اپنی ساری محرومیوں کا ازالہ اپنے بچوں کو اپنی مادری زبان سے محروم کر کے وصول کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے بچوں کو عوام الناس سے اکثر دور رکھا جاتا ہے مبادا ان کے انگریزی طور طریقوں کو نظر لگ جائے یا پھر مشرقی ذہن کے لوگ انہیں خواہ مخواہ ہی تنقید کا نشانہ بنائیں۔ بالکل جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے چھپا کر چیل کوؤں سے بچاتی ہے ایسے ہی یہ بچے اوور پروٹیکشن کا شکار ہوتے ہیں۔

یہ بچے زیادہ تر للی وائٹ علاقوں یعنی انگریزوں کی اکثریت والے علاقوں میں پائے جاتے ہیں تاکہ انگریزی زبان و تہذیب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں انہیں کوئی دقت نہ ہو۔ اندرون شہر یہ بچے اپنے والدین کے ساتھ کبھی کبھی سبزی' گوشت کی دکانوں پر آ تو جاتے ہیں مگر ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہیں کہ پاکی ایریا میں کہاں آ گئے۔ والدین شادی بیاہ پر اکثر اکیلے ہی آتے ہیں تاکہ انہیں دیسی نظروں سے بچا سکیں مگر ان کی شادیوں کے لیے اکثر و بیشتر دیسی گھرانے ہی ڈھونڈے جاتے ہیں کیونکہ اتنی انگریزیت کے باوجود مڈل کلاس انگریز انہیں کالا

ہی سمجھتے ہیں مگر یہ خود کو کونٹ (ناریل) بنے ہوتے ہیں یعنی باہر سے براؤن اندر سے سفید۔

ایسے بچوں کو والدین پاکستان کم ہی لے کر جاتے ہیں کیونکہ انہیں وہاں کی گرمی، گرد و غبار اور بے ہنگم ٹریفک دیکھ کر ہول آتا ہے۔ پڑھنے کے لیے انہیں ایسے سکولوں میں بھیجا جاتا ہے جہاں مشکل سے کوئی دیسی بندہ نظر آتا ہے تاکہ رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے۔ یہ ولایتی بچے رشتہ داروں کو اول تو جانتے نہیں کیونکہ والدین اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اگر بد قسمتی یا خوش قسمتی سے کسی رشتہ دار سے واقف ہو جائیں تو نزدیک آنے سے گھبراتے ہیں۔ رشتہ دار اگر کبھی گھر پر وارد ہو جائیں تو یہ سلام کلام کیے بغیر ہی اٹھ جاتے ہیں۔ والدین کبھی کبھار انہیں کہہ دیتے ہیں کہ آنٹی یا انکل کو سلام کرو تو وہ آدھا سلام یعنی آنٹی سلام، انکل سلام کہہ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ والدین ان کی اس ادا پر صدقے واری ہوتے ہوئے کہتے ہیں "بھئی ولایتی بچے ہیں، اپنے طور طریقوں سے واقف نہیں ہیں۔"

ایک گھر میں ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے لوگ ان کی دنیا ہوتے ہیں۔ سجا سجایا گھر، اچھی گاڑیاں، سینما، تھیٹر، ہوٹلنگ، ہالیڈیز۔ بس، یہی ان کی زندگی کا منتہائے مقصود ہوتا ہے۔ نہ کسی کے فائدے میں نہ کسی کے نقصان میں، جیسے دنیا میں آتے ہیں ویسے ہی خاموشی سے واپس چلے جاتے ہیں۔ انگریزی فلمیں، انگریزی زبان و میوزک، کلب وغیرہ وغیرہ ان کی گفتگو کے خاص موضوع ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی تعریف کرتے ان کی زبان نہیں تھکتی۔ انگریز کی طرف

داری میں ایسے ایسے دلائل دیں گے کہ انگریز بھی سنیں تو وہ بھی شرم سے پانی پانی ہو جائیں۔ اس بات پر ان کا سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ مغربی معاشرے میں تعصب یا ریس ازم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ پاکستان اور پاکستانیوں کی برائی کرتے نہیں تھکتے اور اکثر کہتے ہیں کہ بھئی ہمارے لوگ ہی غلط ہیں' کونسی برائی ان میں نہیں ہے۔ اب اگر انگریز انہیں برا سمجھتے ہیں تو اس میں قصور ان کا نہیں' یہ ہمارے لوگوں کا قصور ہے۔

اپنی قوم' ملک' زبان و تہذیب اور کمیونٹی سے کٹے ہوئے یہ ولایتی بچے گوشہ گمنامی میں ہی زندگی گزار کر راہی عدم ہو جاتے ہیں۔ اپنی دیسی سوچ رکھنے والی کمیونٹی سے بچانے کے لیے بعض والدین کو ان کی دوسرے مذاہب' زبان' تہذیب اور قومیت کے لوگوں سے شادی کرنے پر کوئی خاص اعتراض نہیں ہوتا ہے۔ ہاں البتہ کچھ والدین بڑھاپے کا خیال کر کے ان کی شادیاں دیسی لڑکیوں سے بھی کروا دیتے ہیں تاکہ گھر میں مفت کی کنیز آ جائے جو شوہر اور بچوں کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت بھی کرتی رہے۔

جیسا کہ انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ "چائلڈ از دی فادر آف مین" یعنی کہ بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے' ایسے ہی یہ بچے اپنے باپ کے باپ ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر اپنے والدین کو اپنے مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں اور والدین بادل نخواستہ ان کے مشوروں پر عمل بھی کرتے رہتے ہیں کیونکہ اب اور کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا' بچوں کو کسی اور نظریے پر چلانے کا وقت نکل چکا ہوتا ہے۔ والدین پوری طرح ان کی گرفت میں ہوتے ہیں جہاں وہ پھڑ پھڑا تو سکتے ہیں مگر پنجرہ توڑ کر

باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ایسے وقت میں یہ والدین اکثر سرد آہیں بھرتے نظر آتے ہیں کیونکہ یہ ولایتی بچے ان کی رعایا بننے سے صاف صاف انکار کردیتے ہیں اور ان کے کسی دیسی نظریے کا اطلاق اپنے اوپر کروانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ والدین اگر ایک کہیں تو یہ دس سناتے ہیں' والدین کو زبان بندی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

ایسے ولایتی بچوں کے والدین اگر بیمار پڑ جائیں اور ان کے عزیز رشتہ دار انہیں دیکھنے کے لیے جانا چاہیں تو اکثر یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ اب مریض پہلے سے بہتر ہے' آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فون پر ان سے بات کریں یا کارڈ بھیج دیں جسے وہ سینے سے لگا کر سو جائیں گے' عیادت کے لیے جانے والے حیران پریشان کہ ہمیں گھر میں آنے سے کیوں منع کر رہے ہیں۔ اب ان عقل کے اندھوں کو کون سمجھائے کہ انگریز لوگ زیادہ تر کارڈ یا پھول ہی بھیجتے ہیں' دوسروں کے گھر جتھے بنا کر نہیں جاتے وگرنہ اڑوس پڑوس کے لوگ یعنی انگریز پریشان ہو جائیں گے کہ اس گھر میں کیا مصیبت آگئی ہے۔ بے چارے رشتہ داروں کو چین اس وقت آتا ہے جب ان عزیزوں کی موت کی خبر ملتی ہے' اس خبر پر انہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ دل کو پیٹیں یا جگر کو روئیں کیونکہ آخری خبریں آنے تک تو سب اچھا کی گردان ہو رہی تھی' یہ اچانک عزرائیل نے مارشل لاء لگا کر زندگی کا آئین کیوں منسوخ کر دیا۔ کم بخت رشتے دار چاہے خوشی ہو یا غمی پیچھا ہی نہیں چھوڑتے' بال کی کھال اتارنا تو کوئی ان سے سیکھے۔ کتنا بھی ان سے بچنے کی کوشش کرو ملاقات کی سبیل نکال کر ہی دم لیتے ہیں۔ ذرا تعلیم یافتہ اور رکھ رکھاؤ والے رشتے دار تو گوارا ہیں

مگر یہ جاہل ان پڑھ تو مصیبت ہیں۔ عورتیں خواہ مخواہ ہی بے ہنگم آوازیں نکال کر رو رہی ہیں چاہے آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ ہو۔ مرنے والے سے محبت ہے کہ اُمڈی پڑتی ہے چاہے زندگی میں سیدھے منہ کبھی اس سے بات نہ کی ہو۔ بے چارے ولایتی بچے ان اچانک حملوں سے سخت گھبرا جاتے ہیں اور ان کے نزدیک موت سے زیادہ بڑی ایمرجنسی سے بھگتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ تو سوچتے ہیں کہ 999 ڈائل کر کے مدد طلب کی جائے مگر کنفیوژن کا شکار ہوتے ہیں کہ کونسی سروس طلب کریں کیونکہ رشتہ داروں کو بھگانے والی سروس ابھی ایجاد نہیں ہوئی۔ گورے تو بہت پہلے سے رشتہ داریوں سے ناتے توڑ چکے اور منہ موڑ چکے ہیں، چونکہ یہ شعبہ ان کا نہیں ہے اس لیے کسی ایسی سروس کا ہونا وقت اور پیسے کا زیاں ہے۔

مختصر یہ کہ ولایتی بچے ہمارے شاعر مشرق علامہ اقبال کے شاہین بچے تو بالکل نہیں ہوتے بلکہ یہ وہ بچے ہیں جن کے لیے اقبال نے کہا تھا کہ ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

تو بھی کرتا ہے بہت پیار مجھے
کس قدر پیار کی ارزانی ہے

(شاہدہ حسن)

محبت کی کار فرمائیاں

چونکہ یہ کائنات جذبہ محبت کے تحت ہی معرض وجود میں آئی ہے شاید اسی لیے ہر کس و ناکس اس کا دعویٰ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس قدر ارزانی دعوؤں کی ہے اتنی ہی ناقدری اس پاکیزہ جذبے کی ہو رہی ہے جبکہ دلوں میں جنم لینے والا یہ خوبصورت اور نازک سا جذبہ تو مالک کی خاص دین ہے جسے جب چاہے اس سے نواز دے اور جسے چاہے محروم رکھے۔

اس بیچاری صنف کے بارے میں بھی انوکھے ہی نظریات ہیں مثلاً یہ پہلی ہی نظر میں ہو جاتی ہے' اس کے بعد چاہے ہزار بار دیدے گھما گھما کر دیکھو' چشمہ لگا لو یا خوردبین سے دیکھنے کی کوشش کرو' دل کی لہروں میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے ہم اسے ذرا ضدی اور خود سر قسم کی چیز بھی کہہ سکتے ہیں۔

دوسرا خیال اس کے بارے میں یہ ہے کہ یہ جنس مخالف کے درمیان ہی وقوع پذیر ہونا زیادہ پسند کرتی ہے حالانکہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے' یہ تو دنیا بنانے

والے نے آدم و حوا کے درمیان انہیں دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی پیدا کر دی تھی۔ جذبہ محبت کے ساتھ سیکس ڈسکریمی نیشن کرنا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ اس کا مرکز و محور اور بہت سے رشتے اور چیزیں بھی تو ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ماں باپ کی اولاد کے لیے محبت، بہن بھائیوں، عزیزوں، رشتہ داروں اور خاص طور پر دوستوں میں محبت کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

رشتوں ناتوں کے علاوہ ان انسانوں سے محبت کرنا جو زندگی میں اعلیٰ جذبوں اور اچھے نظریات و مقاصد سے محبت کرتے ہیں۔ زندگی کی ارفع و اعلیٰ قدروں سے محبت، فطرت کی رنگینیوں سے محبت، غرضیکہ یہ جذبہ پوری کائنات میں اس طرح جاری و ساری ہے اور اتنی شدت سے پھیلا ہوا ہے کہ اسے صرف مرد اور عورت کے خانوں میں قید کر دینا زیادتی ہے۔

محبت کے بارے میں کچھ بھی کہئے، یہ ہے بڑی الگ قسم کی چیز۔ یا تو یہ ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان کچھ نہیں ہوتا البتہ لاتعلقی، بیزاری اور سرد مہری ضرور ہوتی ہے۔ جب نہیں ہوتی تو برسوں ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی عنقا ہوتی ہے اور ہونے پر آتی ہے تو برسوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر لیتی ہے۔

کبھی کبھی تو محبت کی اس تیز رفتاری پر ہمیں رشک آتا ہے کیونکہ یہ ہماری گاڑی سے زیادہ تیز بھاگتی ہے۔ اس وقت ہمیں اس سے حسد بھی ہونے لگتا ہے جب ہماری گاڑی چلنے سے بالکل انکار کر دیتی ہے۔ لیکن یہ تو کسی مشاق گھوڑے کی طرح اسپیڈ بریکرز کی پروا کیے بغیر سب حدود و قیود پھلانگتی ہوئی آگے ہی بڑھتی

چلی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں تو اولمپک ریس میں اتھلیٹس کی بجائے اگر محبت کو دوڑایا جائے تو ہمیشہ ہی گولڈ میڈل جیت کر لائے۔

اپنی تیز رفتاری کے باوجود کبھی کبھی یہ ون وے ٹریفک کی طرح بھی ہو سکتی ہے جس میں ایک فریق تو عرش معلیٰ تک پہنچ جاتا ہے جبکہ دوسرے کو خبر بھی نہیں ہوتی، لیکن اس میں بھی کچھ زیادہ قصور محبت کا نہیں ہوتا بلکہ جذبوں میں تھوڑی گڑبڑ ہو سکتی ہے کیونکہ اگر جذبے خالص ہوں تو کبھی نہ کبھی دل کو دوسری پارٹی کے دل کے تاروں کے ساتھ ملا ہی دیتے ہیں، مگر اس کے لیے تاروں کا آپس میں صحیح طرح سے جڑنا بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ارتھ کو نیوٹرل کر دیا جائے، اس بے احتیاطی کے نتیجے میں زبردست دھماکہ ہو سکتا ہے اور شکل و صورت کچھ یوں بن سکتی ہے جیسے کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا۔ لیکن محبت کرنے والے پھر بھی یہ کہنے سے باز نہیں آتے کہ کالا شاہ کالا میرا کالانی دلدار تے گوریاں نوں پراں کرو۔

ایسی حالت میں بھی ہمیں گورے پتا نہیں کیوں یاد آجاتے ہیں، ہماری یہ درگت انہوں نے تو نہیں بنائی ہوتی۔ آخر ہم تھرڈ ورلڈ کے لوگ اپنی ساری محرومیوں کا ذمہ دار گوروں کو ہی کیوں ٹھہراتے رہتے ہیں۔ یہ چٹی چمڑی والے تو ہمیں بہت مظلوم لگتے ہیں۔ اقتصادی محاذ ہو یا سیاسی اور معاشرتی، ثقافتی معاملہ ہو یا عسکری، ہم سب خرابیوں اور برائیوں کو ان کے سر تھوپ کر انہیں بخشنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ بیچارے دوہری مصیبت کا شکار۔ نہ یہاں بخشش اور نہ وہاں بخشش کی وعید۔ جائیں تو جائیں کہاں! یہ کہاں جائیں گے البتہ ہم ان کی دل

جوئی کرنے ان کے دیسوں میں ہر جائز و ناجائز طریقے سے بر آمد ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ بھی کہئے گورے ہیں بڑے صابر، مجال ہے جو منہ سے ایک لفظ بھی نکال جائیں۔ اتنی لعن طعن ہونے پر بھی ہنس ہنس کر تھینک یو تھینک یو کہتے رہتے ہیں مگر خاموشی سے ہماری جڑیں کاٹتے رہتے ہیں۔

ویسے جڑیں کاٹنے میں ہم خود بھی ماہر ہیں پھر بھی شکوہ کرتے رہتے ہیں کہ خون سفید ہو گیا ہے۔ خون پتلا یا گاڑھا تو ہو سکتا ہے بھلا سفید کیسے ہو سکتا ہے۔ شکر ہے انگریزوں کو اس دیسی محاورے کا علم نہیں ورنہ وہ اپنی ساری ریسرچ کا رخ خون کا رنگ معلوم کرنے کی طرف موڑ دیتے۔

محبت کی ایک پریشان کن خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کبھی تو نظر آتی ہے اور کبھی سلیمانی ٹوپی پہن لیتی ہے۔ محبت کرنے والوں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ بھئی یہ عملی طور پر آپ کو نظر نہ بھی آئے تو کچھ خاص فرق نہیں پڑتا، دل میں تو ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں تو یہ خوبصورت جذبہ صرف الفاظ تک محدود نہیں کیا جا سکتا، اس کا عملی مظاہرہ بھی ہونا چاہیے۔

محبت ہمیشہ سے مظلوم رہی ہے۔ ظالم سماج اور اس کے درمیان ایسی رسہ کشی ہوتی ہے جیسے امریکہ اور روس کے درمیان اور آخر میں روس کی طرح ناکام عشاق دل کے ہزار ٹکڑے لیے صحرا میں نکل جاتے ہیں۔ اگر ظالم سماج مہربان ہو جائے تو روس کو گلے میں پھولوں اور نوٹوں کے ہار پہنا کر دلہن کے گھر لے جانے میں قباحت محسوس نہیں کرتا۔ ہمیشہ سے مظلوم اور ناکام رہنے والی یہ چیز ان رنگ برنگے صدموں سے نڈھال ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں شادی سے

پہلے محبت کا دم بھرنے والے شادی کے بعد اس کے منکرین میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ محبت کی اس تذلیل پر بیوی جب ماتھے پر ہزاروں بل ڈال کر کمر پر ہاتھ رکھ کر اور کبھی کبھی ہاتھ میں بیلن پکڑ کر (کپڑے دھونے والا ڈنڈا مغربی ممالک میں نہیں ملتا) اپنے سابقہ عاشق اور حالیہ مجازی خدا سے ڈائیلاگ کرتی ہے تو مزہ ہی آجاتا ہے۔ "شادی سے پہلے تو تم عاشقوں کے قبیلے کے سردار تھے۔ سرد آہیں بھر بھر کر ہماری گلی کو ٹھنڈی سڑک بنایا ہوا تھا۔ اب کہاں گئی تمہاری محبت۔" بیوی کے ان ڈائریکٹ سوالات پر میاں بچنے کا کوئی راستہ نہ پا کر ڈرتے ڈرتے کہتے ہیں "ہاں یہ سچ ہے کہ جوانی میں ایسی حماقت ضرور سرزد ہوئی تھی مگر تب بات اور تھی، ہر لڑکی جولیٹ نظر آتی تھی"۔ "ناں تو میں اب تمہیں کیدو نظر آتی ہوں، تب کی بات اور تھی کا کیا مطلب مگر میں تو وہی ہوں اور تم کیا بوڑھے ہو گئے ہو؟" اس تفتیش پر میاں جان بخشی کی درخواست دائر کرتے ہیں کہ اگر ان کا پیچھا چھوڑ دیا جائے تو ان کی سات پشتوں پر احسان ہو گا۔

آپ ذرا ایسی بیوی کی ذہنی اور جذباتی حالت کا تصور کریں جس نے زندگی کی بنیاد ہی محبت کے دھواں دھار ڈائیلاگ سن کر رکھی ہو، وہ ایسے میں شیرنی کی طرح دھاڑنے اور ناگن کی طرح بل کھانے کا مظاہرہ بھی نہ کرے تو اور کیا کرے۔ الزام پھر بیچاری عورت پر۔ واہ ری! کیا نصیب لے کر آئی ہے تو......

ہمارے خیال میں تو یہ بہت غیر اخلاقی حرکت ہے۔ شوہروں کو چاہیے کہ بیویوں کو ایسے صدمات سے دوچار نہ کریں۔ اگر یہ چاہتی ہیں کہ آپ زبان سے محبت کا اقرار ایک بار نہیں بلکہ بار بار کریں تو کر لیا کریں، آپ کے کونسے پیسے

خرچ ہوتے ہیں۔ یہ وعدوں اور وعدہ خلافیوں پر پلنے والی مخلوق خوش ہو جائے گی۔ ایک بار ہاں کر کے پھنس گئے تو دوسری بار ہاں کر کے خیریت سے نکل جائیے۔

اس کے برعکس کچھ دل پھینک قسم کے شوہر بیویوں سے زناٹے دار عشق کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے اصلی شوہر ہونے پر ہمیشہ شک ہی رہتا ہے کہ عشق اور وہ بھی بیوی سے' توبہ کس قدر بدذوق ہیں! یہ کام ان سے یقیناً کوئی مجبوری ہی کروا رہی ہوگی ورنہ عشق تو نام ہی ناکامی اور نامرادی کا ہے۔ عشق میں وصال نو گو ایریا ہے۔ یہ حسرت و یاس کے گھر میں رہتا ہے۔ آنسو اس کی غذا' میٹھا میٹھا درد اس کی تفریح' بے خواب راتیں اس کا مقدر' ریت جیسی چبھن آنکھوں کا کاجل' جنون اس کا دست راست' یادیں اس کا سرمایہ اور محبوب کا چہرہ کائنات کا کل منظر۔ سچے عاشقوں کو نہ بچھڑنے کا غم اور نہ ملنے کی خوشی۔ نشاط غم میں وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہر کسی کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔

دراصل قدرت نے انسان کی فطرت میں جو لچک رکھی ہے وہ اسے ہر قسم کے حالات کا عادی بنا دیتی ہے۔ درد عشق انہیں اتنا عزیز ہو جاتا ہے کہ اگر کبھی محبوب کے ملنے کا ذرا سا بھی امکان پیدا ہو جائے تو یہ گھبرا اٹھتے ہیں۔ اس حالت میں وہ اپنے محبوب کو ٹھکرانے سے بھی گریز نہیں کرتے کیونکہ صرف ایک شخص کے وصال سے وہ کیسی کیسی جاں سوز کیفیات سے محروم ہو جائیں گے اور یہ گھاٹے کا سودا سچے عاشق تو ہرگز نہیں کر سکتے' ہاں البتہ شوہر صاحبان کرنا چاہیں تو انہیں کون منع کر سکتا ہے!

بھلا جو چیز بیوی کی شکل میں دن رات شوہر کا طواف کرے، دن میں چار کی بجائے پانچ موسم بدلے، فرمائشوں کا لامتناہی سلسلہ ہو، تو اس سے کوئی بہت دبنگ قسم کا میاں ہی عشق کر سکتا ہے۔ خیر یہ دلوں کے معاملے ہیں اور دل دریا سمندروں ڈونگے ہوتے ہیں۔ اب یہ تو میاں ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ اصلی عشق ہے یا ریہرسل ہو رہی ہے اور اصل ڈرامہ کسی اور اسٹیج پر ہوتا ہے۔

اپنے اپنے روزن زنداں کی تنہائی میں قید
عورتیں سب بچے بوڑھے اور سارے مرد بھی

(رخشندہ نوید)

کاش پوچھو

پچھلے دنوں ایک پرانے واقف کار سے ملاقات ہوئی تو دیکھتے ہی شکوہ کرنے لگے۔ یہ آج کل آپ خواتین کے مسائل پر بہت لکھ رہی ہیں۔ مردوں سے کیا قصور ہو گیا ہے کیا وہ آپ کو نظر نہیں آتے۔ ہم نے کہا ایسی کوئی بات نہیں ہے' مرد تو ہمیں ضرور نظر آتے ہیں بلکہ چار چار نظر آتے ہیں کیونکہ چار بیویوں کے شوہر کو ہم چار مردوں کے برابر ہی سمجھتے ہیں۔ وہ صاحب کچھ جز بز سے ہو گئے کہ آپ تو غیر سنجیدہ ہو گئیں۔ مردوں کے بھی بہت سے مسائل ہیں بلکہ شاید عورتوں سے زیادہ گھمبیر ہیں' مگر انہیں کوئی درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتا۔ ان صاحب کی بات سن کر ہم زندگی میں پہلی بار خوشگوار حیرت کا شکار ہوئے کہ یا الٰہی خیر--- یہ کیا ماجرا ہو گیا؟ ہم تو سمجھتے تھے' بلکہ اب بھی سمجھتے ہیں کہ خواتین کے سارے نہیں تو بہت سارے مسائل کے ذمہ دار مرد حضرات ہی ہیں' مگر یہاں تو یہ معاملہ ہو گیا کہ ہم الزام ان کو دیتے تھے' قصور اپنا نکل آیا۔

آخر رواداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہم نے نہایت خوش اخلاقی سے ان حضرت سے کہا کہ بھئی لکھنے لکھانے کے معاملے میں ہم بالکل تعصب کے قائل نہیں۔ مسئلہ عورت کا ہو یا مرد کا' وہ تو آخر مسئلہ ہی ہوتا ہے۔ ہاں آپ اگر واقعی سمجھتے ہیں کہ مردوں کی اس دنیا میں مردوں کے بھی مسائل ہیں تو ہمیں ان پر لکھتے ہوئے روحانی خوشی ہوگی۔ ہماری اس فراخدلانہ پیشکش پر وہ صاحب کچھ کھسیانے سے ہوگئے۔ فرمانے لگے' آپ مذاق تو نہیں کر رہی ہیں۔ ہم نے کہا مذاق کیا کرتے تھے' اب نہیں کرتے۔ اب تو ہم بے حد سنجیدہ ہوگئے ہیں۔

ہماری یقین دہانی پر ان کی ذرا ہمت بندھی تو فرمانے لگے کہ سب سے بڑا گلہ تو ہمیں یہ ہے کہ آخر عورتیں اپنے خود ساختہ مسائل کا ذمہ دار مردوں کو کیوں سمجھتی ہیں؟ وہ تو بے حد معصوم ہوتے ہیں۔ نہایت بے ضرر قسم کی چیز' پیدائش ہی سے عورت کے رحم و کرم پر' وہ بھلا احسان فراموش کیسے ہوں گے کہ عورت کے لیے مسائل پیدا کریں۔ دراصل عورتیں ان کے لیے مسائل پیدا کرتی ہیں۔ اب دیکھئے ناں' یہ بھی عورتوں کی مردوں کے خلاف کتنی بڑی سازش تھی کہ اچھے بھلے جنت میں رہتے تھے اسے بہکا دیا اور وہاں سے نکلوا کر ہی دم لیا اور پھر یہ زمین بیچارے مرد کے لیے جہنم بنادی۔ ایک لمحے کی لغزش سے ساری نسل انسانی صدیوں سے سزا بھگت رہی ہے اور غضب یہ کہ اوپر سے عورتیں الزام تراشی کرتی رہتی ہیں۔

ہم نے کہا" ہاں' مسئلہ تو واقعی ٹیڑھا ہے۔ اس کا حل تلاش کرنے میں تو بڑی عرق ریزی کرنا پڑے گی" تو پلٹ کر بولے "آپ حل تلاش کرنے کو

چھوڑیئے، پہلے بندے کو پوری عرضی تو داخل دفتر کرنے دیں۔" ہم نے کہا "فرمایئے جی! بندی کی کیا مجال کہ آپ کو راستے میں ٹوکے۔" میری بات سن کر دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بڑے دکھی ہو کر کہنے لگے کہ "دراصل مرد ہونا ہی بذات خود بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس قدر امیدیں وابستہ کرلی جاتی ہیں بیچارے مرد سے کہ ان پر پورا اترتے اترتے وہ زندہ درگور ہو جاتا ہے۔ اب دیکھئے ناں! ہماری پیدائش کے لیے کتنی دعائیں اور منتیں مرادیں مانگی جاتی ہیں، پیدائش پر لڈو بٹتے ہیں، شادیانے بجتے ہیں، ہماری پرورش کتنے نازو نعم سے ہوتی ہے۔ بیچاری لڑکیاں ہمیں دیکھ دیکھ کر کڑھتی ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اب ہم پر اتنی محنت یونہی تو نہیں کی جاتی۔ بہت سے امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں ہم سے جیسے دودھ دینے والی گائے کی بڑی سیوا کی جاتی ہے ویسے ہی ہماری ناز برداریاں ہوتی ہیں، کیونکہ بعد میں ہمارا خون نچوڑنا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا بھئی آپ تو ماشاء اللہ ابھی جوان ہیں، نئی نئی شادی ہوئی ہے، میرے خیال میں تو یہ آپ کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔ ایسی کوئی خاص گھریلو ذمہ داری بھی ابھی آپ پر نہیں پڑی۔ ماں باپ حیات ہیں، کوئی خاص مالی پریشانی بھی نہیں ہے تو کہنے لگے جی یہی تو بات ہے۔ کوئی ہمارے مسئلے کو ٹھیک سے سمجھتا ہی نہیں ہے۔ جس سے بات کرو سب اچھا ہے کا نعرہ لگا کر ہمارا دل توڑ دیتا ہے۔ ہم نے کہا نہیں ضرور کہئے، بددل نہ ہوں، معاملہ کیا ہے؟ تو بولے --- دیکھئے نا پہلے تو برطانیہ میں یونیورسٹی میں پڑھائی کے لیے گرانٹ ملتی تھی۔ وہ اب برائے نام رہ گئی ہے۔ اب قرض اٹھانا پڑتا ہے۔ گویا ابھی عملی زندگی کا آغاز بھی نہیں کیا کہ

مقروض ہو گئے۔ پڑھائی کے بعد نوکری نہیں ملتی اور اگر مل بھی جائے تو تنخواہ اتنی کم کہ بچت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اوپر سے ماں باپ کو شادی کی فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ بیٹا برسرروزگار ہو گیا ہے، کہیں گوری کے چکر میں نہ پڑ جائے۔ اسے کھونٹے سے باندھ دو، شادی نہ کرو تب مصیبت، کرلو تب مصیبت۔ اب بیوی کے ناز نخرے الگ اٹھاؤ۔ سیر سپاٹے، زیور، کپڑے، میک اپ، تحفے تحائف۔ اب ان سب کے لیے رقم کہاں سے آئے؟ بیوی کا خیال کرو تو ماں ناراض ہوتی ہیں اور ماں کی فکر کرو تو بیوی مصیبت کھڑی کر دیتی ہے۔ نہ جانے کیسے کیسے الفاظ سے نوازا جاتا ہے ہمیں کہ ساری مردانگی اور عزت نفس کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ کیا عورتیں ذرا قناعت پسندی اور صبروشکر نہیں کر سکتیں؟ میں نے کہا کہ آپ کی تسلی کے لیے اتنا بتا سکتی ہوں کہ جہنم میں زیادہ عورتیں ہوں گی اور جانتے ہیں کس لیے؟ اپنے خاوندوں کی ناشکری اور ناقدری کرنے کے لیے۔ اس پر وہ صاحب خوش ہو گئے کہ چلو اچھا ہے ایک مسئلے کا حل تو نظر آیا۔ اب کہئے دوسرا مسئلہ کون سا ہے تو بولے:

بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ڈال دی جاتی ہے اور چھوٹے سب جان بچا کر نکل جاتے ہیں۔ بھئی عجیب منطق ہے، بیٹا چھوٹا ہو یا بڑا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بیٹا تو بیٹا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ذمہ داری سب پر برابر کی ہونی چاہیے۔ دیکھیں ناعید، شب برأت، مرن جیون، جب دیکھو بڑے بھائی کو آگے کر دیا جاتا ہے کہ باپ کی جگہ ہے۔ بھئی ہم پر بڑی کرم نوازی ہوگی اگر ہمیں بیٹا ہی رہنے دیں، باپ نہ بنائیں۔ کیونکہ باپ تو ہم

اپنے بال بچوں کے بھی ہوتے ہیں۔ اب ایک باپ اتنے کم وسائل میں اتنے سارے بچوں کی صحیح طرح سے پرورش کیسے کرے گا؟ میں نے کہا بات تو آپ کی دل کو لگتی ہے۔ میرے خیال میں تو اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ بڑے بیٹے کو شادی ہی نہیں کرنی چاہیے تاکہ ان کی قربانیوں اور خدمات سے سارا خاندان خوش رہے اور بیٹے کی دنیا اور عاقبت سنور جائے۔

وہ صاحب تو اپنے دل کی بھڑاس نکال کر چلتے بنے مگر ہمیں لکھنے کے لیے ایک دلچسپ موضوع دے گئے۔ دل نے کہا کیوں نہ لگے ہاتھوں کسی ایسے مرد سے بات کی جائے جن کی شادی پرانی ہو گئی ہو اور جن مسائل کی نشاندہی پہلے والے صاحب کر رہے تھے، ممکن ہے عمر کے اس دور میں مسائل کچھ اور ہوں اور شاید مسائل کا کوئی حل نکل آیا ہو۔

یہ صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیشنل ہیں۔ شادی کو دس بارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ بظاہر تو ان کی گھریلو زندگی پرسکون نظر آتی ہے، مگر معلوم نہیں پرسکون سمندر کے اندر کیسے کیسے طوفان کناروں سے لپٹنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ بیوی زیادہ خوبصورت ہو تب مسئلہ، خوبصورت نہ ہو پھر بھی مسئلہ ہے۔ زیادہ خوبصورت بیوی کی نگرانی شوہر کو کرنا پڑتی ہے اور دوسری صورت میں بیوی شوہر کی نگرانی کرتی رہتی ہے۔ بیوی کی کسی خوش شکل سہیلی سے بات کر لو تو جان کو آ جاتی ہے۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ ہو جاتی ہے۔ گھر کیا بلکہ بیگار کیمپ بن جاتا ہے۔ سارے فرائض بجالاتے رہو، پھر بھی طعن و تشنیع جان نہیں چھوڑتے الزام تراشی شروع ہو جاتی ہے کہ تم کو تو میں اچھی ہی نہیں لگتی،

دوسری عورتوں سے لہک لہک کر باتیں کرتے ہو اور گھر آ کر خاموش طبع بن جاتے ہو۔ تمہیں تو مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔ تمہارے گھر کالے بالوں کے ساتھ آئی تھی، تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی خدمت گزاری کرتے کرتے سفیدی آ گئی، مگر مجال ہے جو کبھی تم نے شکریئے کے دو بول بولے ہوں۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ کیا ہمارے بالوں میں سفیدی نہیں آ گئی۔ ان کی صلواتیں سنتے سنتے سفیدی کیا بلکہ بال ہی داغ مفارقت دینے لگے ہیں۔

بیوی زیادہ پڑھی لکھی ہو تو اور مصیبت ہے۔ کوئی بات اس سے چھپا ہی نہیں سکتے۔ سب حالات حاضرہ کا پتا رہتا ہے محترمہ کو۔ یہ بیوی کم اور اماں بلکہ استانی زیادہ بنی رہتی ہیں۔ یہ نہ کرو' وہ نہ کرو۔۔۔ ساری کتابوں کے نسخے اور نصیحتیں ہم پر آزمائی جاتی ہیں۔ اماں کی بات تو کبھی پلے باندھی نہ تھی اور یہاں جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ ہر وقت یہی طعنے تم میں ذرا نظم و ضبط نہیں ہے۔ ڈسپلن نام کی کسی چیز سے تم آشنا ہی نہیں ہو گویا ہمیں دوبارہ سکول داخل کرانے کا پروگرام بنائے بیٹھی رہتی ہیں۔ میرے خیال میں تو بیوی کو کم تعلیم یافتہ اور کم عقل ہونا چاہیے۔ مرد کی جان بہت سے عذابوں سے بچی رہتی ہے۔ ہم نے جسارت کر کے کہا کہ اندھی' بہری اور گونگی بھی ہونی چاہیے تاکہ کوئی مسئلہ ہی پیدا نہ ہو تو کہنے لگے نہیں نہیں' یہ حل مت بتایئے مسئلے کا ورنہ اور بہت سے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔

ہم نے پوچھا اور کوئی مسئلہ ہے تو کہنے لگے بالکل ہے۔ مرد کا حق ہے چار شادیاں کرنا۔ اب دوسری شادی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ پہلی بیوی میں کوئی

نقص ہو، بس دل آگیا گدھی پر تو پری بھی کیا۔ اور محترمہ ہیں کہ آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ سارا خاندان دشمن بن جاتا ہے کہ دوسری شادی کا نام کیوں لیا؟ اب انصاف کی بات کریں، دیکھیں ایک ہی کھونٹے سے بندھی تو گائے بھینس بھی ڈکرانے لگتی ہیں۔ ہم تو آخر مرد ہیں، تھوڑی سی آزادی تو ہونی چاہیے۔ ہم نے کہا کہ ایسی آزادی کا مطالبہ عورتیں بھی کرنے لگیں تو جانتے ہیں اس معاشرے کا ڈھانچہ کیا ہو گا جو پہلے ہی دم توڑتی ہوئی خاندانی قدروں کی وجہ سے آخری سسکیاں لے رہا ہے تو وہ حضرت بے یقینی سے ہمارا منہ تکنے لگے۔

یہ تو تھے شادی شدہ یعنی بیویوں والے حضرات۔ اب ایک ایسے حضرت سے بات ہوئی جو سنگل پیرنٹ ہیں۔ بیوی کوئی دس سال پہلے فوت ہو گئی تھی۔ دو بچے چھوٹے تھے۔ انہوں نے ماں باپ دونوں بن کر انہیں پالا۔ دوسری شادی کی جسارت نہیں کی۔ اب جبکہ بچے بڑے ہو گئے ہیں تو ساتھی کی کمی انہیں شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ کہتے ہیں پہلے تو حیرت ہوتی ہے جب مرد حضرات ہی اس بات پر مجھے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ بھئی اب شادی کی کیا ضرورت ہے، جس وقت ضرورت تھی اس وقت تو کی نہیں اور یہ وہ مرد ہیں جو گھروں میں اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم نے کہا عورتوں سے تو آپ کو کوئی شکایت نہیں ہے ناں۔ کہنے لگے نہیں بلکہ عورتیں تو میرے حالات سن کر بہت ہمدردی کرتی ہیں، بلکہ رشتے ڈھونڈنے میں بھی لگی رہتی ہیں۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو کم از کم کوئی ایک شخص تو ملا جس کو عورتوں سے شکایت نہیں ہے۔ اب یہ مردوں کا مسئلہ ہے کہ مرد حضرات ایسے تنہا زندگی

گزارنے والوں سے کیا سلوک روا رکھتے ہیں۔ ہم پرائی آگ میں کیوں جلیں؟

یہ تو سب وہ مرد حضرات تھے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ہم نے سوچا کہ لگے ہاتھوں کسی ایسے مرد سے بات کی جائے جو ذرا کم پڑھا لکھا ہو۔ اس سلسلے میں ایک صاحب سے بات ہوئی تو فرمانے لگے 'بھئی مرد تو بادشاہ لوگ ہیں۔ انہیں کیا مسئلہ وسلہ ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلے مسائل تو عورتوں کے ہوتے ہیں۔ یا ان مردوں کے جو عورتوں کی الٹی سیدھی باتوں کا اثر لیتے ہیں۔ یہ دراصل پڑھے لکھے مرد بھی بڑے کمزور ہوتے ہیں جی جو خود اپنے لیے مسئلے کھڑے کر لیتے ہیں۔ ہم تو ٹھونک بجا کر خدمت لیتے ہیں۔ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں اور ڈکار مارتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ یہ مہاشے سب سے زیادہ ٹھیک جا رہے ہیں۔ انہوں نے تو بات ہی ختم کر دی ہے۔

گویا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا مردوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے کیونکہ جتنی تعلیم زیادہ ہوتی ہے 'اتنی سوچیں' زیادہ لحاظ' رواداری' تہذیب' شائستگی جیسے لاکھوں بکھیڑے ہوتے ہیں۔ وگرنہ گدھے پر کتابیں لادنے کا الزام آ جاتا ہے۔ اب مرد حضرات اتنے گئے گزرے بھی نہیں کہ ایسا الزام سر لے لیں۔ اس لیے تعلیم کا کچھ تو بھرم رکھنا ہی پڑتا ہے۔ ہمارے خیال میں مردوں کے مسئلے کا حل تو یہ ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرنا ہی چھوڑ دیں نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔

غموں پہ ہاتھ ملنا آ گیا ہے
کھلونوں سے بہلنا آ گیا ہے

(رضیہ اسماعیل)

رنگ برنگی ناریاں

سنسکرت زبان کے ادب میں لکھا ہے کہ "جہاں ناری کی عزت ہوتی ہے وہاں دیوتاؤں کا نواس ہوتا ہے۔" بھلا کہاں ناری اور کہاں عزت؟ کیونکہ ناری کی عزت اور بے عزتی کے درمیان بہت تھوڑا فاصلہ ہوتا ہے۔ یہ فاصلہ نہ تو دیوار چین ہے کہ اسے پار نہ کیا جا سکے اور نہ ہی دیوار برلن جسے گرانے میں برسوں لگ گئے۔ ویسے ناری کو بیچاری بنانے کے لیے کسی خاص فارمولے کی ضرورت نہیں ہوتی، بس دو ہاتھ ادھر، دو ہاتھ ادھر اور ناری بن گئی بیچاری۔

ذرا غور کریں کہ ناری کی یہ قدر و منزلت دیکھ کر دیوتاؤں کا نواس کیا خاک ہوتا ہوگا۔ اگر بھولے بھٹکے سے کوئی دیوتا ادھر نکل بھی آتا ہوگا تو ناری کی یہ درگت دیکھ کر بے زبان دیوتاؤں کو سانپ سونگھ جاتا ہوگا۔ زمین کے دیوتاؤں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر کوئی احمق دیوتا ہی وہاں رکنے کی حمایت کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ دیوتا تو سو شکر بجا لاتے ہوں گے کہ آدمی بنا کر اس زمین پر نہیں بھیجا

گیا۔ ان کی قدر و منزلت ان کی اپنی نظروں میں اور بڑھ جاتی ہوگی۔

ناری کے بارے میں دنیا بھر کے ادب میں جو بھی لکھا ہوا ہے، قطع نظر ہمیں تو یہ مخلوق بہت بہادر اور زندہ دل لگتی ہے۔ اس قدر ناروا سلوک کے باوجود اپنی رنگ برنگی طبیعت سے زندگی کے پھیکے پھیکے رنگوں میں دھنک رنگ بکھیرتی رہتی ہے۔

ویسے تو ہر معاشرے میں ناریاں ایک ہی جیسی ہوتی ہوں گی، مگر ہم بات کرنے جارہے ہیں اپنی خاص مشرقی ناری کی۔ اور جو خاص الخاص خوبیاں اس میں ہوتی ہیں، مغرب کی ناری تو ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ ناریوں کی جن خوبیوں کا ذکر ہم کرنے جارہے ہیں وہ سب خصوصیات تو ایک ہی ناری میں ملنا مشکل ہیں کیونکہ ہر ناری کا اپنا اپنا فلسفہ حیات ہوتا ہے جس پر وہ پوری دیانت داری سے عمل پیرا رہتی ہے۔

ناریوں کی گوناگوں صفات کا احاطہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی درجہ بندی کی جائے۔ اس لحاظ سے ناریوں کی اولین قسم کو اگر ناریل سے تشبیہ دی جائے تو کچھ غلط نہیں ہوگا۔ اس قبیل کی ناریاں بظاہر تو سخت جان اور کھردری نظر آتی ہیں، مگر اندر سے بہت نرم و نازک، جذبات و احساسات کی مالک ہوتی ہیں۔ ان کی زبان چاہے پرتھوی، غوری اور شاہین میزائل گراتی رہے لیکن ان کے میزائیلی حملے اتنے تباہ کن نہیں ہوتے، کیونکہ یہ اپنی شعلہ بیانی کے مظاہرے کے فوراً بعد میدان جنگ میں ایک فاتح کی طرح وارد ہوتی ہیں، زخموں سے چور، نیم جان سپاہیوں کو نہ صرف اٹھاتی ہیں بلکہ ان کی مرہم پٹی بھی کرتی ہیں۔

ناریوں کی اس قسم کا ہمیں ذاتی تجربہ ہے۔ خدا غریق رحمت کرے، ہماری ایک بزرگ خاتون ناریوں کی اس تعریف پہ پوری اترتی تھیں۔ ہم اکثر ان کی باتوں سے برہم ہو کر باغیانہ ردعمل کا مظاہرہ کرتے، مگر بعد میں پتا چلتا یہ سب پھوکے فائر تھے۔ زبان دانی کے اس ڈیمانسٹریشن کے بعد وہ نہ صرف پیار کرتیں بلکہ اپنی حالت یا شاید ہماری حالت پر آنسو بہاتیں۔ اگر زیادہ دل گیر ہوتیں تو گلے بھی لگاتیں، مگر اس حسن سلوک کی شرط یہ تھی کہ آپ اس کشت و خون میں جوابی فائر نہ کریں۔

ناریوں کی دوسری قسم وہ ہے جو کنارے کنارے چلتی ہے۔ جھیل ڈل کے کنارے نہیں بلکہ رشتوں اور رشتہ داروں کے کنارے۔ ان کا رویہ انگریزی کے محاورے سٹنگ آن دی فینس والا ہوتا ہے۔ یہ نہ تو کھل کر کسی کی مخالفت کرتی ہیں اور نہ ہی حمایت۔ بس ہاں ہوں سے کام چلاتی ہیں۔ گویا سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن موقع ملنے پر کام ضرور دکھاتی ہیں۔ ان کا یہ امریکن قسم کا رویہ کبھی کبھی دونوں فریقوں کے دل میں ان کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی محتاط رویے والی ناریوں سے آپ کو سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے۔ معلوم نہیں کب داخلی اور خارجی پالیسی بدل لیں۔

ناریوں کی تیسری قسم ناز و انداز میں اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ رومانس ان کی نس نس سے ابل رہا ہوتا ہے۔ شرعی بندھن میں بندھنے کے باوجود گرل فرینڈ کی طرح رہنا انہیں زیادہ پسند ہوتا ہے۔ لیکن، اگر میاں پر کوئی اور گرل فرینڈ قسم کی بیوی ڈورے ڈالنے کی کوشش کرکے تو سخت برہم ہو جاتی ہیں۔ اس وقت یہ

خالص بیوی بن جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں یہ میاں کے ساتھ کلب یا پارٹی میں جانے سے انکار بھی کر سکتی ہیں مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ عقل مند شوہر ان کے انکار پر زیادہ اصرار نہیں کرتے اور اکیلے ہی دشت نوردی کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

ناریوں کی پیاری قسم شوہروں کی بے حد لاڈلی ہوتی ہے۔ جیسے ماں باپ کو پیٹ کروڑی کے بچے۔ ان کی دیکھ بھال ایسے ہوتی ہے جیسے پالنے میں ہوں۔ انہیں چھینک آئے تو شوہر رومال کی بجائے ٹشو پیپر کا پورا ڈبہ لے کر حاضر۔ ذرا ماتھا گرم ہوا تو ڈاکٹر کو بلانے کی بجائے شوہر ایمبولینس بلا لیتے ہیں اور گھبراہٹ میں خود ہسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتے ہیں۔ یہ گرنے لگیں تو انہیں تھامنے کی بجائے شوہر صاحب خود سو بار گر جاتے ہیں۔ میاں خود تو پھٹے پرانے کپڑوں میں رہیں گے مگر پیاری بیگم بہت شان سے اعلیٰ لباس زیب تن کر کے ہر محفل کی جان بنی نظر آئیں گی۔ ایسی ناریاں شوہروں سے اس قسم کا سلوک کیوں کرتی ہیں۔ اس کا جواب یا تو خود وہ یا شوہر صاحب ہی بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔

ان کے مشورہ جات پر شوہر بلا چون و چرا عمل کرتے ہیں۔ ایسے شوہروں کے گھر والے انہیں بہت آسانی سے زن مرید ہونے کا خطاب دے دیتے ہیں، مگر یہ روشن خیالی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں۔ "دراصل ہماری آپس میں بہت انڈرسٹینڈنگ ہے اور لوگ ہم سے جلتے ہیں۔"

عورتوں کی اس قسم سے دوسری عورتیں بہت چڑتی ہیں۔ جہاں موقع ملے ان کے بخئے ادھیڑتی رہتی ہیں، مگر دل ہی دل میں ان پر رشک بھی کرتی ہیں۔ اپنے

نصیب سے شاکی ہوتی ہیں کہ ایسا بھلا مانس خدمت گزار انہیں کیوں نہ ملا۔ کوسنے دے دے کر تھک جائیں تو یہ کہہ کر صبر کرلیتی ہیں کہ بس جی یہ تو سارا نصیب کا کھیل ہے۔

ایسی بیویاں اگر شکل و صورت میں ذرا دبتی ہوں تو پھر سارے خاندان اور محلے کی ہمدردیاں میاں کے ساتھ اور زیادہ ہوتی ہیں۔ بات بات میں اسے مزید بدصورت بنا کر پیش کرنے کا کوئی سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ ان کا منتہائے مقصود سب کو یہ یقین دلانا ہوتا ہے کہ بظاہر یہ محترمہ اس راج سنگھاسن کی مستحق تو نہیں ہیں، بس اپنی اپنی قسمت ہے۔ سجی سجائی ناریوں کا محبوب ترین مشغلہ میک اپ، زیور، کپڑے اور میچنگ جوتے خریدنا ہوتا ہے۔ یہی جوتے بوقت ضرورت شوہر صاحب کے استعمال میں آتے ہیں، اس لیے انہیں جوتوں کی خریداری سے احتراز کرنا چاہیے۔

برطانیہ میں ایسی ناریاں حکومت کے طرف سے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ملنے والے ہفتہ وار الاؤنس یعنی چائلڈ بینیفٹ سے ہر ہفتے نیا جوڑا خریدنا عین عبادت سمجھتی ہیں۔ گھر میں ایسے رہتی ہیں جیسے مہمان آئی ہوں۔ ہر ہفتے کی خریداری کے باوجود کسی خاص موقعے پر پہننے کے لیے ان کے پاس کپڑے نہیں ہوتے (کیونکہ سب کپڑوں کی نمائش تو یہ کر چکی ہوتی ہیں) شوہر مزید خریداری کے لیے اگر قابو میں نہ آئیں تو نفسیاتی حربے استعمال کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ لوگ پرانے کپڑے دیکھ کر کیا کہیں گے۔ میرا کیا ہے میں تو پہن کر چلی جاؤں گی، مگر تمہاری عزت کا کباڑہ ہو جائے گا کہ بیوی کو اس موقعے پر نیا جوڑا بھی لے کرنہ

دیا۔ یہ وار اکثر کارگر ثابت ہوتا ہے اور شوہر صاحب جیب خالی ہونے کے بعد چھت کو خالی خالی نظروں سے گھورتے ہوئے یہ شعر پڑھتے رہتے ہیں ۔

عشق میں ایک تو ہمارا ہے
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

ناریوں کی گرفتاری قسم بہت خطرناک ہوتی ہے۔ یہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے شوہروں پر غیر ضروری دباؤ ڈالتی رہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ ان کے بے تکے خوابوں کی تکمیل کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے سے پیسہ گھر میں آنا چاہیے۔ دوسرے لوگوں کی خوشحالی کی مثالیں دے دے کر شوہروں کو زندہ درگور کرتی رہتی ہیں۔ خود کو مفلس ترین سمجھتی ہیں۔ گو کہ صرف اخلاقی اور ذہنی طور پر دیوالیہ ہوتی ہیں۔ ناریوں کی اس قسم سے شوہروں کو محتاط رہنا چاہیے۔ انہیں شروع سے ہی ایسی ناری کو اپنی اوقات میں رہنے کا درس دینا چاہیے' وگرنہ یہ نہ ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے۔

ناریوں کی ایک قسم گزاری ناریوں کی بھی ہوتی ہے' کیونکہ بقول شوہر صاحبان یہ صرف گزارے لائق ہوتی ہیں۔ یہ شوہروں سے کتنا ہی پیار و محبت کریں' کبھی دل پر نہیں چڑھتیں۔ یہ اکثر و بیشتر والدین کی پسند ہوتی ہیں جو شوہر کے سر منڈھ دی جاتی ہے۔ کبھی وٹے سٹے کی شادیاں بھی ایسی ناریوں کو جنم دیتی ہیں۔ شوہروں کی ساری عمر ایسی ناریوں کی ذات کی نفی کرنے میں گزرتی ہے۔ ایسے شوہر اپنی مظلومیت کے قصے سنا سنا کر دوسری خواتین کی بہت ہمدردیاں سمیٹتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ گلے پڑا ڈھول بجا رہے ہیں' مگر یہ ڈھول اس انداز سے بج رہا

ہوتا ہے کہ گھر بچوں کی کلکاریوں سے گونج رہا ہوتا ہے اور میاں کے اندر کے سناٹے بڑھتے جاتے ہیں۔

ایسے شوہر مستقل طور پر حسرت ویاس کی تصویر بنے رہتے ہیں۔ دردناک قسم کی غزلیں یا پھر سلوک و معرفت والا کلام سنتے رہتے ہیں کیونکہ یہ جسمانی سے زیادہ روحانی تعلق کے قائل ہو جاتے ہیں۔

ناریوں کی اشتہاری قسم کے بارے میں ہماری رائے محفوظ ہے کیونکہ یہ قسم اتنی اوپن ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

بیچاری قسم کی ناریاں ہمارے ملک کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ پیدا ہوتے ہی اذان کے ساتھ ان کے کان میں یہ ڈالا جاتا ہے کہ والدین کا گھر ان کا مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ اس لیے اپنے گھر پر ڈولی میں جاتی ہیں اور کندھوں پر ہی واپس آتی ہیں۔ ان کی پرورش شادی کے نقطہ نظر سے ہی کی جاتی ہے۔ بہشتی زیور ان کا نصاب ہوتا ہے۔ دنیاوی تعلیم سے نابلد رکھی جاتی ہیں اور دینی تعلیم میں بھی ایثار و قربانی' فرمانبرداری اور شوہر پرستی کے تصور کو خوب خوب اجاگر کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول توبتہ النصوح کی ہیروئین ہوتی ہیں۔ ایسی ناریوں کی آنکھوں میں یاسیت اور محرومی کے سائے لہراتے رہتے ہیں۔ منہ سے کچھ نہ کہنے کے باوجود ان کی خاموشی ہزار داستانیں سناتی ہے۔ ہر سال بچہ پیدا کر کے انہیں مصروف رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی اور تفریح ان کے لیے شجر ممنوعہ ہوتی ہے۔ یہ شوہر پرستی میں اتنی آگے نکل جاتی ہیں کہ ہر طرح کا ظلم سہ کر خود کو جنت کی حقدار سمجھتی ہیں۔

ناریوں کی اس قسم میں وہ ناریاں بھی آجاتی ہیں جن کی خدمت کا صلہ کبھی کبھی صرف طلاق کی شکل میں ملتا ہے مگر انہیں چھوڑ کر جانے والے بھی ان کی شرافت کے قائل ہوتے ہیں اور ایک دن کہہ اٹھتے ہیں کہ ۔

حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے

تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

لیکن اس سے ان کے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی۔ کچھ بیوگی کے ہاتھوں بیچارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہ گئے دنوں کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ بڑھاپے میں اولڈ پیپلز ہوم ان کا ٹھکانہ بن جاتے ہیں۔ برطانیہ میں ایسی ناریاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں صحیح معنوں میں جنت کی حقدار یہ فرمانبردار قسم کی ناریاں ہی ہوتی ہیں۔

ناریوں کی ہوشیاری قسم تقریباً ناریوں کی سبھی قسموں میں پائی جاتی ہے مگر بیچاری قسم کی ناریاں اس زمرے میں نہیں آتیں۔ ویسے مردوں کے نزدیک سب ہی ناریاں ہوشیار ہوتی ہیں مگر یہ قسم کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہوتی ہے۔ یہ میاں کے کام پر جانے کے بعد گھر کے چھوٹے موٹے کام نپٹا کر اگر بچوں کا جھنجٹ ہے تو انہیں سکول میں پھینک کر مٹر گشت کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ ونڈو شاپنگ کے علاوہ محلے کی خیر خبر رکھنا' ادھر کی ادھر پہنچانا ان کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ کسی نیوز ایجنسی کی چیف رپورٹر بھی اپنا کام اتنی مستعدی سے نہیں کر سکتی جتنا یہ بغیر تنخواہ کے کام کر دیتی ہیں۔

شوہر کے گھر لوٹنے سے پہلے ہی بچوں کو دنکا دے کر سر باندھ کر لیٹ جاتی

ہیں۔ آخر اتنی محنت کے بعد ہیڈ ایک نہیں ہو گا تو کیا ہو گا۔ دن بھر کی مشقت کے بعد گھر آنے والے شوہر ان کی اجڑی ہوئی حالت دیکھ کر مزید پریشان ہو جاتے ہیں۔ سیدھے سادے قسم کے شوہر تو تیمار داری میں لگ جاتے ہیں مگر اکھڑ قسم کے شوہر دوسرے طریقوں سے ان کی خبر لیتے ہیں۔

ہماری پوری ہمدردیاں ایسے شوہروں کے ساتھ ہیں۔ ان ناریوں کے شوہر اگر بے روزگار ہو جائیں تو یہ سخت ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہیں۔ شوہر سے زیادہ انہیں کام کی فکر ہوتی ہے' کیونکہ ان کی صحافتی اور سماجی سرگرمیاں سرد پڑ جاتی ہے۔

ناریوں کی آخر الذکر قسم کمیاب ہوتی ہے۔ ہم انہیں چنگاری ناریاں بھی کہتے ہیں۔ ناریوں کی یہ قسم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پر اعتماد ہوتی ہے۔ اپنی ذات اور ماحول کا شعور و ادراک ہونے کی وجہ سے یہ عورت پر غیر ضروری سماجی دباؤ کے خلاف ہوتی ہیں۔ فرسودہ رسم و رواج جو عورت سے امتیازی سلوک روا رکھتے ہیں' انہیں دل سے ناپسند کرتی ہیں۔ عورت کی ذہنی اور فکری بالیدگی کو بہت ضروری سمجھتی ہیں۔ ہر طرح سے روایت شکنوں کی صف میں شمار ہوتی ہیں۔

ناریوں کی یہ قسم عامیانہ سوچ رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ذہنی تنگ نظری سے سخت الرجک ہوتی ہیں۔ آپ کے دلائل میں وزن ہو تو ضرور غور کرتی ہیں' لیکن بے جا ضد اور ہٹ دھرمی سے آپ انہیں قائل کرنے کی بجائے ہتھے سے اکھاڑ سکتے ہیں۔ ان ناریوں کے ساتھ سطحی اور روایتی سوچ رکھنے والے مردوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اگر خوش قسمتی یا

بدقسمتی سے یہ آپ کے پلے یا آپ ان کے پلے سے بندھ گئے ہیں تو جیو اور جینے دو کی پالیسی پر عمل کریں۔ آپ بھی خوش اور یہ بھی آسودہ' وگرنہ ان کے شعلوں سے بچنا ناممکن ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(مرزا غالب)

سرونٹ

متوسط طبقے میں انہیں نوکر اور اعلیٰ طبقے میں انہیں سرونٹ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ سرونٹ کوارٹرز میں رہتے ہیں۔ جس طرح اپر کلاس ہر جگہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتی ہے، اسی طرح نوکروں کے بارے میں بھی وہ کافی کانشیس ہوتی ہے۔ ان کی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے ہی انگریزی کا یہ لفظ ایجاد ہوا ہے۔ متوسط طبقہ چونکہ نوکری پہ گزارا کرتا ہے اس لیے وہ ہر ایک کو نوکر ہی سمجھتا ہے۔ انہیں خود اپنی رہائش کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اس لیے وہ سرونٹ کوارٹر مہیا نہیں کرسکتے۔ غریب طبقہ نوکر رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اس لیے خود نوکر بن جاتا ہے۔

نوکر کیہ تے نخرہ کیہ۔ کسی زمانے میں یہ محاورہ درست تھا مگر اب نہیں چلتا۔ اب تو نوکر کا نخرہ مشہور ہے۔ نوکروں کے زیادہ نخرے کاہل قسم کی بیگمات کو زیادہ اٹھانا پڑتے ہیں کیونکہ اگر نوکر ہاتھ سے نکل جائے تو پھر بیگمات کے اپنے

نخرے خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ اس قسم کی بیگمات شوہروں کی بدولت کم مگر نوکروں کی بدولت زیادہ عیش کرتی ہیں۔ شوہر کی ناراضگی قابل برداشت ہے مگر نوکر کی ناراضگی سے بیگمات سخت قسم کے ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ڈپریشن ویسے ہی ہماری عورتوں میں زیادہ ہے۔ متوسط طبقے کی بیویاں تو زندگی کے شب و روز میں کچھ اس طرح الجھی رہتی ہیں کہ انہیں ڈپریس ہونے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ آٹے دال' گھر کے بلوں اور بچوں کے سکول کے اخراجات کا حساب کتاب ہی ان کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

متوسط طبقے میں گھر والی کو بیوی اور اپر کلاس میں بیگم کہا جاتا ہے۔ یہ فرق صرف نام کا ہی نہیں ہوتا' کام کا فرق بھی ہوتا ہے۔ بیوی کو ہزاروں لاکھوں جھمیلے ہوتے ہیں جبکہ بیگم بے غم ہوتی ہے۔ اسے اگر کوئی غم ہوتا ہے تو صاحب کے معاشقوں کا۔ اپنی فگر' ڈھلتی ہوئی جوانی اور اسٹیٹس برقرار رکھنے کا۔ بیگم کی زندگی صاحب کے چکر میں کم لیکن نوکروں کے چکروں میں زیادہ گزرتی ہے۔ اسی لیے بیگمات کو چکر زیادہ آتے ہیں۔ راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ سلیپنگ پلز کے باوجود نیند کی دیوی ان پر مہربان نہیں ہوتی۔

بیگمات کا سب سے بڑا غم نوکروں کا انہیں چکر دینا ہے۔ نوکروں کی چک پھیریاں انہیں ادھ موا کر دیتی ہیں۔ انہیں باقی سب غم حقیر لگتے ہیں لیکن نوکروں کے نخروں کا غم ان کی پہلے سے برباد شدہ زندگی کو مزید برباد کر دیتا ہے۔

یہ بربادی صرف پاکستانی بیگمات کا مقدر ہے۔ برطانیہ میں بیگمات نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی بیگم بھولے بھٹکے سے اس سرزمین پر جا نکلے تو کانوں کو ہاتھ لگاتی

ہوئی واپس آجاتی ہے۔ توبہ توبہ۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ جھاڑو، برتن، کپڑوں سے لے کر ٹائلٹ تک خود صاف کرو۔ مالی اور ڈرائیور کے ساتھ ساتھ دربان ہونے کا فریضہ بھی خود ہی سرانجام دو۔ برطانیہ ایسی خواتین کے لیے جیل سے کم نہیں۔ اس لیے انہیں سوچ سمجھ کر برطانیہ کا رخ کرنا چاہیے۔

ذرائع ابلاغ کی ترقی نے اب بیگمات کی معلومات میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ انہیں پتہ چل گیا ہے کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ باہر کے ممالک میں صرف سیر و تفریح اور شاپنگ کے لیے جاتی ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ ایسے تفریحی دوروں پر بھی نوکروں کی فوج ظفر موج ساتھ رکھیں۔ امیگریشن والے انتہائی جاہل اور بدذوق لوگ ہیں جو بیگمات کے اس غم اکبر کو نہیں سمجھتے۔

بیگمات کے بارے میں نوکروں کو جس قدر معلومات ہوتی ہیں، صاحب ساری زندگی بیگم کے ساتھ گزار کر بھی لاعلم رہتے ہیں۔ ویسے صاحب کے لیے لاعلم رہنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اگر صاحب علم دار ہو جائے تو بیگم، بیگم نہیں رہتی بیوی بن جاتی ہے اور بیگمات ایسی توہین کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتیں۔

جس طرح بیویوں کی درجہ بندی ہے، اسی طرح نوکروں کی درجہ بندی بھی کی جاتی ہے۔ نوکروں کی اعلیٰ نسل خاندانی نوکر ہوتے ہیں جو نسل در نسل کسی خاندان کی غلامی کا بانڈ بھرتے ہیں۔ یہ فیملی کے فرد ہی تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ بیگمات تھرڈ ریٹ قسم کا سلوک کرنے کی ہمت نہیں رکھتیں۔ الٹا انہیں نوازتی رہتی ہیں۔ نوکروں کی دوسری قسم گشتی نوکروں کی ہوتی ہے۔ یہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے رہتے ہیں۔ ایک دن یہاں، دو دن وہاں۔ یہ گھوم پھر کر میلہ

دیکھنے والے نوکر ہوتے ہیں۔ ذرا سی سرزنش پر دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ ایسے نوکروں کے ہتھے چڑھنے والی بیگمات کی زندگی بہت دردناک ہوتی ہے۔ ہر جگہ ان کی گفتگو کا موضوع نوکر ہی ہوتا ہے۔ بیگمات صاحب کے طور طریقوں اور خیالات سے کم لیکن نوکروں کے ہتھکنڈوں سے زیادہ واقف ہوتی ہیں۔ صاحب تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ خاص طور پر دولت مند بیگمات کے لیے صاحب پالنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اچھے نوکر اتنی آسانی سے نہیں ملتے۔

برطانیہ میں خواتین نوکروں کا جھنجھٹ نہیں پالتیں۔ اس لیے نوکری بھی کرتی ہیں۔ نوکروں کی لمیٹڈ سپلائی کی وجہ سے وہاں صرف گارڈنرز اور رونڈ و کلینرز ہی نصیب ہوتے ہیں۔ اچھا گارڈنر اور رونڈو کلینر ڈھونڈنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ حتی المقدور کوشش کی جاتی ہے کہ پرسنل ریفرنس سے کوئی اچھا کام کرنے والا مل جائے۔ مگر ایسا ہوتا بہت کم ہے۔ اکثر اخبارات میں دیے گئے اشتہارات پر ہی تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ جی ہاں۔ برطانیہ میں نوکر خود اشتہار دیتے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں نوکروں کے لیے اشتہارات دیے جاتے ہیں۔ ان اشتہارات کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ہمارا ملک کتنا امیر ہو گیا ہے اور روزگار کے مواقع کس قدر بڑھ گئے ہیں۔

نوکروں کی اتنی زبردست ڈیمانڈ کے باوجود پتہ نہیں ہم ابھی تک ترقی پذیر ممالک کی صف میں کیوں کھڑے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم نوکروں کی حد تک تو ہم ترقی یافتہ کہلانے کے حقدار ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں عوام الناس کے لیے کل وقتی نوکر رکھنا ناممکنات میں

سے ہے۔ یہ شرف صرف امیروں اور رئیسوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ کل وقتی یعنی فل ٹائم سرونٹ صحیح معنوں میں نوکر ہوتے ہیں۔ اور اپنے انگریز صاحبوں اور میموں کی خدمت جی جان سے کرتے ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے ملک میں نوکروں کے نخرے دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ انہیں ٹریننگ کے لیے انگریز صاحب کے پاس چھوڑ دیا جائے۔ ویسے نوکروں کی علت بھی انگریزوں کی دین ہے۔ گورا صاحب تو اپنا ہیٹ' سگار اور چھڑی لے کر چلا گیا اور پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ لیکن ہم نے اپنی خاک اڑانے کے لیے خود کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ زندہ قوموں کی یہی نشانی ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں صرف نوکر رکھے ہی نہیں جاتے' پالے بھی جاتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ جانور پالے جاتے ہیں' غم پالے جاتے ہیں یا پھر پرندے پالے جاتے ہیں۔ نوکر کیسے پال سکتے ہیں۔ وہ تو خود مالکوں کو پالتے ہیں' دانہ دنکا دیتے ہیں۔ نوکر گھر میں نہ ہو تو میم اور صاحب چائے کی پیالی تک سے محروم رہ جاتے ہیں۔

نوکروں کی پالتو قسم کو بچپن سے ہی گود لے لیا جاتا ہے۔ ان کے گلے میں اپنے نام کا پٹہ ڈال کر انہیں سگھڑ بیٹی کی طرح ہر کام سکھایا جاتا ہے لیکن بیٹی کے برعکس ایسے نوکر کی رخصتی کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ انہیں گھر والوں سے زیادہ خبر ہوتی ہے کہ کون سی چیز گھر کے کس کونے میں پڑی ہے۔ ان کے ناز نخرے صحیح معنوں میں اہل خانہ کو اٹھانا پڑتے ہیں۔ کیونکہ اتنی لونگ ٹرم انوسٹمنٹ کے بعد

آدمی گھاٹے کا سودا ہر گز نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہ منہ پھٹ بھی ہو جاتے ہیں۔ ذرا سخت سست کہنے پر ان کی عزت نفس کو بہت زیادہ ٹھیس لگ جاتی ہے۔ ایک دن کی چھٹی لے کر کئی دن غائب رہنے پر بھی کھل کر انہیں لعنت ملامت نہیں کی جاسکتی۔ مبادا یہ کہ کسی دوسری بیگم کے ہاں پولیٹیکل اسائیلم لے لیں۔

حال ہی میں ہمیں ایک ایسے ہی گھر میں جانے کا موقعہ ملا۔ اتفاق سے نوکر چھٹی پر تھا۔ ہماری سادگی کا اندازہ لگائیں کہ ہم نے بیگم صاحبہ سے گاجر کے جوس کی فرمائش کر دی۔ ہماری اس ناہنجار فرمائش پر بیگم صاحبہ بادل نخواستہ کچن میں چلی گئیں۔ مگر کافی دیر تک جب ان کی شکل نظر نہ آئی تو ہمیں تشویش ہوئی۔ ہم نے دبے قدموں سے رسوئی کا رخ کیا جہاں بیگم صاحبہ جو سر سے ماتھا پھوڑ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر اوپری مسکراہٹ سے بولیں دراصل نوکر ہی یہ سب کام کرتا ہے۔ میں نے تو کبھی جوس نکالا نہیں اس لیے کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ استعمال کیسے کرنا ہے۔

بیگم صاحبہ اگر اناڑی تھیں تو ہم بھی کھلاڑی نہیں تھے۔ دراصل برطانیہ میں جوس نکالنے کی تکلیف نہیں کرنا پڑتی۔ ہر قسم کے جوس دیدہ زیب پیکنگ میں باآسانی مل جاتے ہیں۔ ہم بھی اوپری مسکراہٹ سے بولے کوئی بات نہیں۔ جانے دیں۔ کوئی اور ڈرنک نہ لے لیتے ہیں مگر بیگم صاحبہ بضد تھیں کہ جوس نکلے گا تو گاجر کا ہی وگرنہ کچھ اور پینے کو نہیں ملے گا۔

ہم نے بیگم صاحبہ کو فراخدلانہ پیشکش کی کہ ہم بھی ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ خیر ہمیں یہ تو پتہ چل گیا کہ گاجریں ڈالنا کہاں ہیں مگر جوس کدھر سے نکلے گا' اس کا

صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔ ہم سمجھے کم بخت جوس بھی اندر ہی کسی ڈبے میں جائے گا۔
جیسے ہی گاجروں کی سپلائی کر کے ہم نے جوسر آن کیا' سرخ سرخ جوس نے کچن
کے ورک ٹاپ کو جل تھل کر دیا۔ ہم شرمندہ شرمندہ سے ایک دوسرے کو دیکھنے
لگے لیکن بیگم صاحبہ ہم سے زیادہ شرمندہ نظر آ رہی تھیں۔ کیونکہ مہمان بھی ان
کے تھے' جوسر بھی ان کا۔ گاجریں بھی ان کی اور سب سے بڑھ کر نوکر بھی ان کا
اور وہ بھی پالتو نوکر۔

ان حالات کے پیش نظر ہم بیگمات کو یہی مشورہ دے سکتے ہیں کہ اگر ایسے
نوکر مل جائیں تو یا تو انہیں بالکل چھٹی نہ دیا کریں۔ احتیاط سے سیف ڈیپازٹ
لاکر میں رکھیں یا پھر ان سے کچھ کام سیکھ لیا کریں۔ کیونکہ ایسے نوکر اگر مل کر بچھڑ
جائیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اگوں تیرے بھاگ لچھیے۔

جب بیاں کرو گے تم ہم بیاں میں نکلیں گے
ہم ہی داستاں بن کر داستاں میں نکلیں گے

(عدیم ہاشمی)

موازنے

سیاست دان، پولیس، ڈاکٹر، گداگر اور طالب علم کسی بھی معاشرے کے بہت اہم ستون ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہم اکثر ان کے رویوں کی شکایت کرتے رہتے ہیں، لیکن اگر انہیں معاشرے سے دربدر کر دیا جائے تو شاید کچھ مسائل کا حل تو نکل آئے لیکن بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو جائیں گے جو پہلے سے زیادہ گھمبیر ہوں گے۔ اس لیے عقل مندی اسی میں ہے کہ انہیں ان کا کام کرنے دیا جائے اور آپ صرف انہیں خاموشی سے کام کرتے ہوئے دیکھتے رہیں۔

پولیس

ہمارے ملک کی پولیس اور برطانیہ کی پولیس میں چند فنڈامینٹل فرق ہیں۔ مثلاً برطانوی پولیس کی وردی گہرے نیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ سرخ و سپید رنگت پر پر تکلف وردی پہن کر یہ جب ایک شان سے گشت پر نکلتے ہیں تو پتہ چل جاتا ہے

کہ قانون آرہا ہے۔

انہیں اردو بولنا نہیں آتی اس لیے انگریزی بول کر کام چلاتے ہیں۔ اب کچھ پولیس والوں نے اردو اور کچھ دوسری ایشیائی زبانیں سیکھ لی ہیں۔ زبان سیکھنے میں زیادہ مشکل پیش آئے تو پھر اردو بولنے والے پولیس مین بھرتی کئے جاتے ہیں اور بوقت ضرورت مترجم کی خدمات حاصل کرلی جاتی ہیں۔ ہمارے ایشیائیوں کو پولیس کا یہ امتیازی سلوک ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب "می نو انگلش" کہہ کر پولیس کو چکر دے دیا جاتا تھا۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی کا ڈنڈا نہیں ہوتا بلکہ قانون کا ڈنڈا ہوتا ہے۔ جسے یہ واکی ٹاکی کے ذریعے قانون شکنوں پر برساتے رہتے ہیں۔ یہ پیدل کم ہی چلتے ہیں' اکثر نئی رجسٹریشن کی چمچماتی گاڑیوں یا اعلیٰ نسل کے گھوڑوں پر گشت کے لیے نکلتے ہیں۔

ہمارے ہاں مجرم زیادہ صحت منداور ہشاش بشاش لگتے ہیں' جبکہ برطانیہ میں پولیس اور مجرم کا فرق صاف نظر آتا ہے۔ یہ پولیس مقابلے نہیں کرتے کیونکہ ڈرپوک ہوتے ہیں۔ انہیں اگر مجرم للکارے بھی تو یہ اسے زندہ ہی پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے ان کی اپنی جان چلی جائے۔ ان کی گرفت میں آیا ہوا مجرم مشکل سے ہی بھاگ سکتا ہے۔

اس حسن سلوک کے باوجود لوگ ان کی شکایت بھی کرتے ہیں جبکہ اپنی پولیس کی لوگ ہر وقت شکایت ہی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ثابت ہو جائے کہ انہوں نے کسی سے زیادتی کی ہے تو چیف کانسٹیبل نہ صرف معذرت کا خط لکھتا ہے بلکہ پولیس کے خاص فنڈ میں سے ہرجانہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔

اگر ہمارے پولیس والوں کی شکایت کی جائے تو یہ الٹا شکایت کنندہ کو اندر بند کر دیتے ہیں اور خود ہرجانہ وصول کر لیتے ہیں۔ ہماری پولیس اور برطانوی پولیس میں وردی کی رنگت، جلد کی رنگت اور زبان کے فرق کی وجہ سے ان کے کام میں بھی بہت فرق ہو جاتا ہے، مگر اس پولیس میں بس ایک بری عادت ہے کہ یہ زیادہ تر میلی رنگت والوں کو ہی پکڑتی ہے۔ اس کے برعکس ہماری پولیس نے ہر طرح کی بری عادتیں پالی ہوئی ہیں اور یہ لوگوں کے رنگ کی بجائے ان کا سوشل اسٹیٹس دیکھ کر انہیں گرفتار کرتی ہے۔

سیاست دان

انہیں اپنی زبان میں سیاست دان اور انگریزی میں پالیٹیشن کہا جاتا ہے۔ سیاست دان اور پالیٹیشن میں بڑا فرق یہی ہوتا ہے کہ پالیٹیشن اصلی اور سچی پالیٹکس کرتے ہیں لیکن سیاست دان صرف سیاست ہی نہیں کرتے باقی اور سب کچھ کرتے ہیں۔ پالیٹیشن سال کے بارہ مہینے اپنے ووٹرز سے رابطہ رکھتے ہیں اور اگر کبھی ووٹرز انہیں یاد نہ کریں تو یہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے سیاست دان صرف الیکشن کے دنوں میں منہ دکھائی کی رسم ادا کرتے ہیں اور الیکشن جیتنے کے بعد اعتکاف میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی زیارت کرنا محبوب کی زیارت کرنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ہمارے شعراء کو چاہیے کہ سنگدل روایتی محبوب کی بجائے سیاستدانوں کو محبوب بنائیں۔ وہ ان سے جس طرح کا سلوک کریں گے اس کے نتیجے میں اگر شاعری کی بجائے چھٹی کا دودھ یاد نہ آجائے تو ہمیں مطلع

کریں۔

پالیٹیشن اگر کسی بد نظمی یا کرپشن میں پکڑے جائیں تو جانتے بوجھتے ہوئے بھی پالیٹکس میں رہنے پر اصرار نہیں کرتے بلکہ شرمندگی کے مارے استعفیٰ دے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس سیاست دان نہ صرف جرم کرنے کے باوجود اپنی بے گناہی پر اصرار کرتے ہیں بلکہ آیت کریمہ پڑھا پڑھا کر خدا کو بھی پریشان کرتے رہتے ہیں۔

پالیٹیشن صرف جینوئن کام کے لیے سفارش کرتے ہیں بلکہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں اپنے ووٹرز کی مدد کریں جبکہ سیاست دان غلط کام کروانے کے لیے سفارشیں کرتے ہیں۔ برطانیہ کے پالیٹیشن بھی وعدے وعید کرتے ہیں مگر کم کم۔ انہیں علم ہوتا ہے کہ اگر وعدے پورے نہ کئے گئے تو ووٹرز ان کا حقہ پانی بند کردیں گے۔ لیکن سیاست دانوں کو اگر وعدے یاد دلائے جائیں تو یہ ووٹرز کا حقہ پانی بند کر دیتے ہیں۔ وعدہ خلافیوں پر ہمارے سیاست دانوں پر عوام ٹماٹروں اور گندے انڈوں کی بارش کرتے ہیں جبکہ پالیٹیشن کی وعدہ خلافی کی صورت میں ووٹ گندے انڈوں اور ٹماٹروں کا کام کرتے ہیں۔

گداگر

آپ یہ مت سمجھیں کہ برطانیہ میں فقیر نہیں ہوتے۔ ضرور ہوتے ہیں مگر ہمارے فقیروں جتنے بدحال اور ڈھیٹ نہیں ہوتے۔ بھیک مانگنے میں بھی عزت نفس کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ یہ مسکین مگر مہذب ہوتے ہیں۔ بھیک نہ بھی ملے

تو آپ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر فقرے بازی نہیں کرتے۔ مگر ہمارے فقیر رعب سے مانگتے ہیں اور کچھ نہ ملنے کی صورت میں ان کی دعاؤں کو بددعاؤں میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی۔

برطانیہ کے فقیروں کے سبھی اعضاء سلامت ہوتے ہیں کیونکہ یہ جسمانی بلیک میلنگ کے ذریعے بھیک نہیں مانگتے۔ اس کے برعکس ہمارے فقیروں کے ہاتھ پاؤں خود توڑ دیئے جاتے ہیں۔ وہاں کٹے پھٹے بازوؤں' ٹوٹی ٹانگوں اور مڑے تڑے ہاتھوں اور بینائی سے محروم لوگ اس پیشے میں نہیں آتے بلکہ ہسپتالوں' نرسنگ ہومز یا گھروں میں حفاظت سے رہتے ہیں۔ ان کے بھیک مانگنے میں بھی تخلیقی پہلو ہوتا ہے۔ یہ اکثر موسیقی سنا کر آپ کو خوش کرتے ہیں۔ اگر پسند آئے تو کچھ دے دیں وگرنہ خاموشی سے گزر جائیں۔ یہ آپ کا پلو نہیں پکڑیں گے' لیکن ہمارے فقیر ابھی تک صدیوں پرانے سلوگن ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہیں ریفریشر کورسز کروانے کی ضرورت ہے۔

کیونکہ برطانیہ میں گداگری جرم ہے اس لیے وہاں کے فقیر کھلے بندوں بھیک نہیں مانگتے۔ اگر ان کے پاس کوئی آلہ موسیقی نہ ہو تو پھر ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھ کر ہی دست سوال دراز کرتے ہیں۔ ان کے پاس بھی اکثر گھر پہنچنے کا کرایہ نہیں ہوتا' لیکن ان کی جیب نہیں کٹتی۔ ہمارے ہاں گداگری ایک منظم پیشہ ہے' جبکہ برطانیہ میں اس کی کمرشل ویلیو نہیں ہے۔ اس لیے کوئی بھی اس بزنس میں ہاتھ نہیں ڈالتا اور گداگر فری لانس کے طور پر ہی کام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر

اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر اور ڈاکو ہونے میں بہت کم فاصلہ ہے۔ جو ڈاکٹر مرض کی تشخیص صحیح طرح نہ کرے، غلط سلط دوائیاں دے کر مریضوں کی جان خطرے میں ڈالے بلکہ انہیں زندگی کی قید سے آزاد کر دے اور پھر بھی بھاری فیس وصول کر کے دن دہاڑے لوٹے، اسے ڈاکو کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

ہمارے ہاں جب جی چاہے، ڈاکٹر تبدیل کریں، مگر برطانیہ میں نسل در نسل لوگ ایک ہی ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ مریض بدتمیزی کریں تو ڈاکٹر مریض بدل لیتے ہیں، لیکن یہاں ڈاکٹر ناروا سلوک کریں تو لوگ ڈاکٹر بدل لیتے ہیں۔

ہمارے ڈاکٹرز پرائمری سے ہائر ایجوکیشن تک کی ساری ڈگریاں بورڈز پر لکھ کر نمائش کرتے ہیں تاکہ ان پڑھ عوام پر رعب رہے، لیکن برطانیہ میں ڈاکٹرز اپنی ڈگریاں یوں چھپا کر رکھتے ہیں جیسے امتحان پاس نہیں کیا تھا بلکہ ڈگری خریدی تھی۔

ہمارے ہاں کے ڈاکٹرز بہت زیادہ خدمت خلق کرتے ہیں۔ دن میں ہسپتالوں میں ہوتے ہیں جبکہ شام میں پرائیویٹ کلینک میں بیٹھتے ہیں اور زیادہ تر ان مریضوں کو دیکھتے ہیں جن کا دن کے وقت ہسپتالوں میں علاج کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے۔ یہ اپنی ڈگریوں کو اچھی طرح کیش کرواتے ہیں اور نوٹوں کے تھیلے بھر بھر کر گھر لے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس برطانیہ میں ڈاکٹر یا تو ہسپتالوں میں کام کرتے ہیں یا پھر اپنے کلینک میں۔ پارٹ ٹائم پرائیویٹ پریکٹس بھی کرتے ہیں مگر انفرادی طور پر نہیں

بلکہ پرائیویٹ اسپتالوں کے ساتھ لیکن عام ڈاکٹرز جنہیں جی۔پی کہا جاتا ہے' وہ بڑے مسکین ہوتے ہیں اور شام کو سرجری سے جاتے ہوئے ان کے بریف کیس میں صرف تھکن' مریضوں کا درد اور پیراسیٹومل کی چند گولیاں ہی ہوتی ہیں۔

طالب علم

انہیں عرف عام میں اسٹوڈنٹس بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علم کی طلب میں کم اور دوسری چیزوں کے حصول میں زیادہ پریشان رہتے ہیں۔ ان کی اس حرکت پر اگر انہیں ان کا اسٹیٹس یاد دلایا جائے تو طیش میں آکر نعرے بازی بھی کرسکتے ہیں' مگر برطانیہ کے طالب علم نعرے نہیں لگاتے' صرف پڑھائی کرتے ہیں اور بہت ہوا تو خاموش احتجاج کرتے ہیں۔ پبلک پراپرٹی کو نقصان نہیں پہنچاتے کیونکہ کل کو انہیں اس نقصان کی تلافی ٹیکسوں کی شکل میں کرنا ہوتی ہے۔

برطانیہ کے سکولوں میں استاد پڑھانا چاہتے ہیں مگر طالب علم پڑھنا نہیں چاہتے حتیٰ کہ اساتذہ انہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور گھروں تک سے پکڑ کر بھی لاتے ہیں۔ اگر وقت کی کمی کی وجہ سے گھروں تک نہ جاسکیں تو سوشل ورکرز کو بھیج دیتے ہیں۔ سکول کے اوقات میں آوارہ گردی کرنے والے طالب علموں کو پولیس پکڑ کر یا تو واپس گھر یا سکول میں لے آتی ہے۔ والدین بچوں کو باقاعدگی سے سکول نہ بھیجیں تو قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے' جرمانے بھرتے ہیں۔ وہاں کے بچے سولہ سال کی عمر تک بڑی مصیبت میں رہتے ہیں کیونکہ سویٹ سکسٹین تک تعلیم لازمی ہے۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں کے طالب علم تو پڑھنا چاہتے ہیں مگر استاد ٹیوشن پڑھانے پر اصرار کرتے ہیں۔ طالب علموں کو سکول میں آنے کی ترغیبات کم اور مولا بخش کی مدد سے بھگانے کے زیادہ نسخے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہمارے اساتذہ کے اس حسن سلوک کی وجہ سے بہت سے طالب علم ہمیشہ کے لیے ہی تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔

ہمارے ہاں بچے کتابوں کی پوری دکان کمر پر لاد کر چلتے ہیں جبکہ وہاں کے طالب علم ہاتھ لٹکاتے سکول جاتے ہیں اور ویسے ہی واپس آجاتے ہیں۔ ہمارے ہاں طالب علم ہوش میں آتے ہی سیاست کے اسرار و رموز سے واقف ہو جاتے ہیں جبکہ برطانوی طالب علم تعلیم سے فارغ ہو کر عملی سیاست میں قدم رکھتے ہیں۔

برطانیہ میں ذریعہ تعلیم جرمن یا فرنچ زبان نہیں بلکہ ان کی اپنی مادری زبان انگریزی ہے۔ اگرچہ وہاں بھی گرائمر، پبلک اور پرائیویٹ سکول ہوتے ہیں لیکن حکومتی سطح پر چلنے والے سکولوں کا معیار اوز سہولتیں بھی ہمارے ملک کے مہنگے ترین سکولوں سے زیادہ بہتر ہیں۔ تعلیمی درسگاہوں کے دروازے ہر شخص کے لیے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں اچھی تعلیمی درسگاہوں کے دروازے صرف امیروں اور سفارشیوں کے لیے کھلے رہتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے جوہر قابل غربت کے ہاتھوں تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔

فارمولے اور تبصرے

فارمولا نمبر1 (پی ٹی وی)

خبرنامہ + ڈرامے + اشتہارات = پی ٹی وی

جب اس دنیائے رنگ وبو کی تخلیق ہوئی تو پاکستان ٹیلی ویژن کے خبرنامے کا سانچہ بھی اسی وقت تیار ہو گیا تھا لیکن اس کی اطلاع اربوں کھربوں سالوں کے بعد اس خطہ زمین تک پہنچی۔ دراصل عرش والے اس انتظار میں تھے کہ پاکستان معرض وجود میں آ جائے۔ اس الہامی خبرنامے کو تبدیل کرنا یا اس میں کوئی ردوبدل کرنا انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے عوام دوسرے ممالک کے خبرناموں پر انحصار کرتے ہیں۔

ڈرامے کی صنعت میں ترقی پر ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ ہماری سرشت میں شامل ہے۔ ہر لمحے زندگی میں ڈرامہ بازی ہوتی رہتی ہے۔ ویسے زندگی سے بڑی کامیڈی اور ٹریجڈی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اندرون خانہ

ڈراموں کو گلیمرائز کر کے ناظرین کے لیے تفریح طبع کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔
ہماری دیکھا دیکھی ہمارے پڑوسی بھی ڈرامے کرنے لگے ہیں۔ ویسے وہ تو ہر روز بلکہ ہر لمحے ایک نیا سکرپٹ لکھتے ہیں۔ انہیں اپنے ڈراموں کی کم مائیگی پر احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ پی ٹی وی کے ڈرامے ساری دنیا میں بہت ذوق و شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے ڈراموں کی دوسری زبانوں میں ڈبنگ کر کے انہیں بین الاقوامی سطح پر پروموٹ کریں۔

اشتہارات کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کی حفاظت بندہ جی جان سے کرتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ ٹوٹ جائے تو بندہ بالکل پالک بن جاتا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اس شعبے نے کافی ترقی کی ہے اور نت نئے چہروں کو منی سکرین پر متعارف کروایا جاتا ہے۔ ان چہروں کی تازگی اور سج دھج دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ملک میں غربت کا بالکل خاتمہ ہو چکا ہے۔ عورتوں کی ڈریس سینس بہت اچھی ہو گئی ہے اور ہمارے ہاں صرف اپر کلاس ہی ایگزسٹ کر رہی ہے۔ ویسے ان اشتہارات کو دیکھ کر کچھ خواتین احساس کمتری کا شکار بھی ہو جاتی ہیں کیونکہ اس قدر بن سنور کر اور چہرے پہ مسکان لا کر گھریلو کام کاج کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے ایڈورٹائزنگ ایجنسیز کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

فارمولا نمبر 2 (زی ٹی وی)

گپ شپ + سارے گاماپا + تھا تھی تھیا = زی ٹی وی

پی ٹی وی کا خبرنامہ اور زی ٹی وی کا سچ گپ ہم پلہ پروگرام ہیں۔ فرق

صرف یہ ہے کہ خبرنامے میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اصل خبر لیک نہ ہو جائے جب کہ زی ٹی وی اصل خبر کو اس طرح بگاڑ کر پیش کرتا ہے کہ اس پر گپ شپ پروگرام کا گمان ہوتا ہے۔ اس لیے بچے اسے شوق سے دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی بڑے بھی دیکھ کر ہنستے ہیں۔ ویسے رو بھی سکتے ہیں مگر ہر روز رونا بھی تو آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے وہ ہنسنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ لافٹر از دی بیسٹ میڈیسن۔ اس کے لیے انہیں زی ٹی وی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

زی ٹی وی کا بریک فاسٹ میوزک، لنچ میوزک اور سپر بھی میوزک ہی ہے۔ ویسے میوزک اگر ڈھنگ کا ہو تو سننے میں ہرج نہیں کیونکہ موسیقی روح کی غذا کہی جاتی ہے۔ مگر اس قسم کی بے ہنگم غذا سے سخت قسم کے ڈائیریا کا اندیشہ رہتا ہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوتا ہے کہ اعضا کی شاعری یعنی رقص کو بھی تینوں وقت کے کھانے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے ہر دو ممالک کے علاوہ جہاں جہاں بھی دنیا میں براؤن چمڑی والے لوگ رہتے ہیں، وہاں نوجوان نسل تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا ہی کرتی رہتی ہے۔

فارمولا نمبر 3 (بی بی سی)

خبریں = بی بی سی

بی بی سی کا قیام خالص خبروں کے نقطہ نظر سے ہی وجود میں آیا تھا اس لیے اس شعبے میں یہ پی ٹی وی اور زی ٹی وی کی والدہ ماجدہ ہیں۔ جو خبریں دونوں ٹیلی ویژن نشر نہیں کرتے، وہ بی بی سی کرتی ہے۔ اس لیے ان کی خبریں بہت مستند مانی

جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ بی بی سی کے اس قسم کے کردار کو دیکھ کر ہمارے گھر میں کام کرنے والی مائی اسے بی بی سلندر کہتی ہے۔ شکر ہے بی بی قلندر نہیں کہتی نہیں تو اس پر بنیاد پرستی کا مقدمہ قائم ہو جاتا۔

فارمولا نمبر 4 (اپر کلاس)

گٹ مٹ + میکڈونلڈ + کے ایف سی + چائنیز = اپر کلاس

ہمارے ملک میں کلاس سسٹم کی گرپ اس طرح ہے جیسے پڑوسی ملک میں ذات پات کی۔ یہ کلاس جسمانی طور پر تو پاکستان میں رہتی ہے مگر ذہنی اور نفسیاتی طور پر یورپ اور امریکہ میں ہوتی ہے۔ مغربی کلچر کو امپورٹ کرنے کے لائسنس ان کے پاس ہیں۔ اپنے ملکی کھانوں سے انہیں بدہضمی ہو جاتی ہے اس لیے ان کے خیر خواہوں نے ان کے لیے برگر شرگر اور سوپ شوپ کا انتظام کر رکھا ہے۔

یہ کلاس ماں بولی میں بات کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہے کہ کہیں ان پر دیسی اور غیر مہذب ہونے کا الزام نہ آجائے۔ اس لیے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں کتنی بھی مشکل پیش آئے' یہ انگریزوں سے غداری نہیں کرتے۔ ان کے نونہال برٹش اور امریکن ایجوکیشن سسٹم کو فالو کرتے ہیں۔ پاکستان کا آؤٹ آف ڈیٹ سلیبس صرف غریب اور متوسط بچے ہی پڑھتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر ملک میں تعلیمی ترقی کا جائزہ لیا جائے تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم مغربی ممالک سے پیچھے نہیں ہیں۔ اس طبقے کے ناز نخروں کی بدولت انہیں وی آئی پی

ٹریٹمنٹ ملتا ہے اور اس امیر ملک کے غریب لوگوں پر حکمرانی کی سعادت بھی انہیں ہی حاصل ہوتی ہے۔

فارمولا نمبر 5 (سسرال)

ساس + نند = سسرال

مجازی خدا جسے خواتین مزاجی خدا بھی کہتی ہیں (کیونکہ یہ مزاج درست کرنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں) یہ ان کی والدہ ہوتی ہیں۔ ویسے انہیں خوشدامن بھی کہا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے ان کے دامن میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوتی ہیں مگر بعد میں انہیں کئی غم دامن گیر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً رسہ گیری' خبرگیری وغیرہ وغیرہ۔ سسرال کی رونق ان کے دم قدم سے ہے۔ جس سسرال میں ساس نہ ہو' اسے یتیم ویسیر سسرال کہا جاتا ہے اور اس سسرال میں پلنے والی بہو کو ناتجربہ کار۔ منہ دکھائی میں ساس نہ ملنے والی بہوئیں بھی بڑی مظلوم ہوتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ ساس کی دست برد سے محفوظ ہیں لیکن وہ زندگی کے اس حسین تجربے سے محروم رہ جاتی ہیں جو ساس کی شکل میں ان کے حصے میں نہیں آتا۔ ساس اور نند ایک ہی تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ساس کی غیر موجودگی میں یہ کاروبار خانہ داری سنبھال لیتی ہیں کیونکہ ماں کی مشیر اعلیٰ ہوتی ہیں۔ شادی شدہ نندوں کو اپنے گھر کی فکر کم اور بھابی کی فکر زیادہ رہتی ہے۔

ساس اور نند کی موجودگی سسرال کی رونقوں کو دوبالا کر دیتی ہے لیکن اگر کہیں نند غیر موجود ہو تو ساس تنہا رہ جاتی ہے۔ ایسی ساس بھی ہمدردی کے لائق

ہوتی ہے کہ اکیلی ہی بہو کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہے۔ نند نہ ہو تو آدھی سسرال اور اگر ساس بھی نہ ہو تو پھر سسرال اور میکے میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا۔

کچھ شوہر بھی کبھی کبھی ساس کا چولا پہن لیتے ہیں۔ ایسے شوہروں کو ٹریننگ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے رول کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور غیر ضروری ٹینشن اپنے سر نہ لیں وگرنہ وہ نہ شوہر رہیں گے اور نہ ساس بن سکیں گے۔

سسرال میں سب لوگ ساس کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ جہاں ساس نہ ہو وہاں بہو کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ ایسی بہوؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے جامے میں رہیں اور معصوم رعایا پر بے جا ظلم نہ کریں۔ کیونکہ ظالم کی رسی دراز تو ہوتی ہے مگر اتنی بھی دراز نہیں ہوتی کہ کبھی پکڑ میں نہ آسکے۔

مصنفہ کی دیگر تصنیفات

1- نذرانہ عقیدت

مجموعہ درود شریف

2- برطانیہ کی اردو قلمکار خواتین

حوالہ جاتی دستاویز (اردو اور انگریزی)

3- رائٹ ٹریک

برطانیہ میں نوجوان ایشیائی قلمکاروں کی تحریریں

(اردو اور انگریزی)

4- گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو

شعری مجموعہ (غزلیں اور نظمیں)

5- آئی ایم اے ویمن

اردو نثری نظمیں بمع انگریزی ترجمہ

شاعروں اور مشاعروں کی بالادستی کے دور میں ایک شاعر کا نثر اور وہ بھی طنزومزاح کی طرف متوجہ ہونا ایک خوش آئند بات ہے۔

رضیہ اسماعیل مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف نہایت سنجیدگی سے معیاری شاعری کی ہے بلکہ نثر لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر لکھنے کا ڈھنگ آتا ہو، مزاج میں اپچ ہو، طبیعت میں روانی ہو تو نثر میں برجستگی اور شگفتگی سے ایسی ایسی جادوبیانی کی جاسکتی ہے کہ اس پر کئی شعر قربان کئے جاسکتے ہیں۔

رضیہ اسماعیل نے نثر لکھ کر اس فصیل کو بہت حد تک توڑ دیا ہے جو آج کے اکثر ادیبوں کے لاشعور میں نثر کی طرف جانے والے راستے میں ایک کوہ گراں بن کر کھڑی رہتی ہے۔

محمود ہاشمی
(برمنگھم۔ برطانیہ)

علی پلازہ 3۔ مزنگ روڈ، لاہور فون : 7238014